فکر و نظر

ہم عجیب امتی ہیں

ہم اپنے نبیؐ سے بہت محبت کرتے ہیں، ان کا نام مبارک ہمارے سامنے لیا جائے تو ان پر صلاۃ و سلام بھیجتے ہیں، ہاتھ چوم کر آنکھوں کو لگاتے ہیں، اپنی مسجدوں میں نماز کے بعد لہک لہک کر ان پر درود پڑھتے ہیں۔ ان کے یوم پیدائش پر خوشیاں مناتے ہیں، قمقمے جلاتے، جھنڈیاں لگاتے اور پہاڑیاں بناتے ہیں، جلوس نکالتے اور نعرے لگاتے ہیں۔ ہم ان کی مدحت کے گیت گاتے اور ان کے ذکر خیر میں پر جوش تقریریں کرتے ہیں۔ اگر کوئی ان کی شان میں گستاخی کر دے تو غصے میں جو چیز ہمارے سامنے آئے اسے تہس نہس کر دیتے ہیں، دکانوں اور بسوں کو آگ لگا دیتے ہیں۔ اگر کوئی گستاخ رسول نظر آ جائے تو اسے قتل کرنا ہم باعث سعادت سمجھتے ہیں...... کہ ہم اپنے نبی سے بہت محبت کرتے ہیں...... لیکن ہم عجیب امتی ہیں کہ ہم اس نبی کی اطاعت کرنے پر تیار نہیں۔ جو کام کرنے کا اس نے حکم دیا ہے ہم وہ نہیں کرتے اور جن کاموں سے اس نے روکا ہے، ہم ان سے نہیں رکتے۔ ہم عجیب امتی ہیں۔

نبیؐ نے کہا تم بھائی بھائی ہو، جسد واحد کی طرح متحد رہو۔ ہم معمولی باتوں پر ایک دوسرے سے لڑتے اور نفرت کرتے ہیں، ایک دوسرے کا گلا کاٹتے ہیں اور پھر بھی ہم نبیؐ سے محبت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ہم عجیب امتی ہیں۔

نبیؐ نے اپنے ایک ساتھی کو تورات پڑھتے دیکھا تو غصے سے چہرۂ مبارک سرخ ہو گیا کہ میرے ہوتے ہوئے اور قرآن کی موجودگی میں اس کی کیا ضرورت؟ آج ہمارے پاس اس پیارے پیغمبرﷺ کی سنت بھی موجود ہے، وہ قرآن بھی موجود ہے جو اس پر نازل ہوا تھا لیکن ساتھ ہم سیکولرازم کو بھی مانتے ہیں، سوشلزم کو بھی مانتے ہیں، لبرلزم کو بھی مانتے ہیں۔ ہم عجیب امتی ہیں۔

نبیﷺ نے کہا وہ مسلمان نہیں جو پیٹ بھر کر کھائے اور اس کا ہمسایہ بھوکا ہو لیکن ہمارے امیروں کے مقامی اکاؤنٹ روپے سے اور غیر ملکی اکاؤنٹ ڈالروں سے بھرے ہوئے ہیں۔ ہمارا وزیراعظم کروڑوں کی گھڑی پہنتا ہے۔ ہمارے دسترخوان طرح طرح کی نعمتوں سے سجے ہیں اور ہمارے ہمسائے بھوکے ہیں اور بھوک سے تنگ آ کر خودکشیاں کر رہے ہیں لیکن پھر بھی ہم نبیؐ سے محبت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ہم عجیب امتی ہیں۔

پاکستان اور اسلام		ڈاکٹر محمد امین

پاکستان میں دہشتگردی
امریکہ و طالبان کا کردار

جہاد یا دہشت گردی - تکفیر یا شہادت - امریکہ و بھارت - طالبان افغانستان و پاکستان اور طالبانائزیشن - حقائق کا تجزیہ اور ان کے بارے میں صحیح شرعی نقطۂ نظر

معروضی مطالعہ کی ضرورت

حالات و واقعات اور علوم خصوصاً مذہبی و سیاسی امور کا معروضی مطالعہ عموماً ممکن نہیں ہوتا تاہم ہر مصنف، دانش ور اور تجزیہ کار کی یہ کوشش ہونی چاہیے کہ وہ حقائق تک پہنچے اور معاملات کو ان کے صحیح تناظر میں سمجھ سکے۔ ہماری رائے میں موضوع زیر بحث کے معروضی مطالعے اور صحیح نتائج تک پہنچنے میں دو رکاوٹیں حائل ہیں۔**ایک** یہ کہ لوگ تازہ واقعات کی تفصیلات اور ان کے نتائج وثمرات میں الجھ جاتے ہیں اور اس پر غور نہیں کرتے کہ ان کا بنیادی سبب کیا ہے؟ وہ درخت کے پھل کے میٹھا یا کڑوا ہونے پر بحث شروع کر دیتے ہیں اور اس پر غور نہیں کرتے کہ پھل کے میٹھا یا کڑوا ہونے کا سبب وہ پانی اور غذا ہے جو درخت کی جڑ کو دی جاری ہے۔اور سبب میں بھی کسی واقعے کے فوری سبب پر انحصار نہیں کرنا چاہیے بلکہ اس سبب کے پیچھے جو سبب الاسباب اور سلسلۂ اسباب ہے، اس تک پہنچنا چاہیے۔جس طرح ایک چیز ہوتی ہے غایت اور دوسری ہوتی ہے غایت الغایات، اسی طرح ایک ہوتا ہے کسی واقعے کا فوری سبب اور ایک دور پیچھے سبب الاسباب ہوتا ہے، اس تک پہنچنا چاہیے پھر کہیں جا کر حقیقت کا چہرہ نکھر کر سامنے آتا ہے۔

دوسری بڑی وجہ جو اس موضوع اور آج کل پاکستان کو درپیش دوسرے معاملات کے معروضی مطالعے میں رکاوٹ بنتی ہے وہ ہے دنیا کی موجودہ غالب مغربی تہذیب سے لاشعوری مرعوبیت اور اس سے متاثر ہونا بلکہ اس کی بالادستی، صدق اور حتمیت پر گہرا ایمان و یقین رکھنا (اگرچہ ساتھ نمازیں اور روزے بھی جاری رہتے ہیں) اس امر کا ادراک واحساس کیے بغیر کہ یہ تہذیب غیر جانبدار نہیں بلکہ الحادی اور اسلام و مسلم دشمن ہے (تفصیلات کے لیے دیکھیے ہماری کتابیں ''اسلام اور تہذیب مغرب کی کشمکش'' اور ''مسلم نشأۃ ثانیہ'') اور اس نے صدیوں محنت، منصوبہ بندی اور سازشوں سے ہماری برین واشنگ کی ہے لہٰذا ہمارے بہت سے پڑھے لکھے جدید تعلیم یافتہ حضرات، دانش ور، بیوروکریٹ اور سیاستدان اسی کی بولی بولتے ہیں لیکن سمجھتے ہیں کہ وہ اپنی بولی بول رہے ہیں اور وہ اسی کی فکر کے تناظر میں سوچتے، مطالعہ

کرتے اور اظہار مدعا کرتے ہیں لیکن سمجھتے اور کہتے یہی ہیں کہ وہ اپنے دماغ سے آزادانہ سوچتے اور بولتے ولکھتے ہیں۔

اس تمہید کے بعد ہم ان معاملات پر اپنی وہ رائے قارئین کے سامنے رکھتے ہیں جو ہمارے نزدیک معروضی اور صحیح ہے، اگرچہ ہمارے دشمن نے کمال محنت اور پُرکاری (بلکہ سرمایہ کاری) سے اس موضوع پر ملت اسلامیہ پاکستان کو تقسیم در تقسیم اور کنفیوز کر رکھا ہے اور ویسے بھی یہ ایک حقیقت ہے کہ مذہب اور سیاست وہ دو مظلوم موضوع ہیں جن کے لیے کسی خصوصی مطالعے، تجزیے اور مہارت کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی بلکہ ایک جاہل سے جاہل آدمی بھی ان پر اپنی 'ماہرانہ' رائے رکھتا ہے اور صرف اسے ہی صحیح اور حتمی سمجھتا ہے۔

جہاد افغانستان کی شرعی حیثیت

افغانستان کے مسلم معاشرے کی روسی حملہ آوروں کے خلاف مسلح جدوجہد بھی جہاد تھی اور ان کی امریکہ (اور اس کے حلیفوں) کے خلاف مسلح جدوجہد بھی جہاد ہے، اس پر عصر حاضر کے جمہور علماء کا اتفاق ہے۔ ہم فقہی باریکیوں اور ان کے حوالہ جات سے صَرفِ نظر کرتے ہوئے (کہ اس تحریر کو فتویٰ یا ہائر ایجوکیشن کمشن (HEC) کے مجوزہ خطوط پر تحقیقی مقالہ بنانا ہمارے پیش نظر نہیں بلکہ اس موضوع کی عام فہم اور درست تفہیم مقصود ہے) عرض کرتے ہیں کہ اسلام میں جہاد (بمعنی قتال) کی دو معروف شکلیں ہیں۔ ایک مسلم معاشرے (دارالاسلام) کی بیرونی غیر مسلم حملہ آوروں سے مدافعت تاکہ مسلمانوں کا ایمان، جان، مال اور عزت محفوظ رہ سکے اور دوسرے اگر استطاعت ہو تو اس قوت کا توڑنا جو اسلام کے صحیح فہم میں مانع ہو اور لوگوں کو کشاں کشاں جہنم کی طرف لے جا رہی ہو، کیونکہ آدم وحوا کی اولاد ہونے کے ناطے غیر مسلم ہمارے بھائی ہیں اور ان کی خیر خواہی کا تقاضا ہے کہ ہم انہیں جہنم کی آگ میں جلنے سے بچائیں۔ اس لحاظ سے کسی مسلمان ملک پر کسی غیر مسلم حملہ آور کی مدافعت ومزاحمت کرنا شرعاً جہاد ہے۔

لیکن یہاں ایک پیچیدگی پیدا ہوتی ہے اور وہ یہ کہ یہ اصلاً مسلم حکومت کا کام ہے کہ وہ مسلم ملک کی بیرونی حملہ آور سے مدافعت کرے لیکن اگر بیرونی حملہ آور قوت مسلمانوں میں سے کچھ کو گماشتہ بنا کر حکمران بنا دے یا مسلمان حکومت ان غیر مسلم بیرونی حملہ آوروں سے مل جائے تو پھر مسلم معاشرے کو کیا کرنا چاہیے؟ کیا بیرونی غیر مسلم حملہ آوروں کی غلامی (بواسطہ گماشتہ حکمرانوں کے) قبول کر لینی چاہیے یا ان دونوں کے خلاف مسلح جدوجہد کرنی چاہیے؟ جمہور علماء کی رائے یہ ہے (جمہور علماء سے ہماری مراد یہ ہے کہ اسلام کے مرکزی دھارے [مین اسٹریم اسلام] کے علماء کی بہت بڑی اکثریت) کہ ان کی مسلح مزاحمت کرنی چاہیے اور یہ شرعی جہاد ہے۔ اگرچہ اصول یہی ہے کہ جہاد حکومت کو کرنا چاہیے لیکن یہ ایک

استثنائی معاملہ ہے کہ جب آزاد حکومت ہی ختم ہوگئی یا دشمن سے مل گئی تو اب عوامی مزاحمت کے سوا چارہ نہیں۔

دو مغالطے

یہاں ایک مغالطہ دیا جاتا ہے کہ دراصل دو آپشنز ہوتی ہیں ایک رخصت کی اور دوسری مسلح مزاحمت کی اور ہندوستان کی مثال دی جاتی ہے کہ ۱۸۵۷ء میں مسلم حکومت کے خاتمے کے بعد مسلمانوں نے غلامی قبول کر لی اور پرامن سیاسی جدوجہد شروع کر دی اور اسی کے نتیجے میں پاکستان بنا لہٰذا عوامی سطح کی مسلح مزاحمت نہ ضروری ہے اور نہ شرعی جہاد ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء میں حکومت کے خاتمے کے بعد علماء نے مسلح مزاحمت کی تھی لیکن وہ کامیاب نہ ہوئی۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ کیا کیا جائے؟ کچھ علماء نے ہندوستان کو دارالحرب قرار دے دیا کہ اس سے ہجرت واجب ہے چنانچہ ہزاروں لوگوں نے مکان اور زمینیں بیچ کر ہمسایہ آزاد ملک افغانستان ہجرت کی لیکن وہاں کی حکومت نے قبول نہ کیا اور وہ خوار و زبوں واپس آئے۔ دوم: علماء نے جہاد کی استطاعت اور کامیابی کا امکان نہ دیکھ کر مجبوراً رخصت کا آپشن استعمال کیا۔ اس سے جہاد کی مشروعیت کا حکم معطل نہیں ہو جاتا بلکہ حکومت کے خاتمے کے باوجود علماء نے مسلح مزاحمت کی تھی۔ کب تک لڑنا ہے اور جیتنے کا امکان کتنا ہے؟ یہ لڑنے والوں کا فیصلہ ہوتا ہے جیسے جنگ موتہ میں حضرت خالد بن ولیدؓ نے فیصلہ کیا کہ یہ لڑنے کے لیے موزوں وقت نہیں چنانچہ پسپا ہو گئے اور خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس فعل کی مدافعت کی اور اسے صحیح قرار دیا۔ لہٰذا افغانستان میں غیر مسلم بیرونی حملہ آور کے خلاف جہاد تو مشروع تھا ہی لیکن یہ فیصلہ بہرحال افغانستان کے مسلمانوں کو کرنا تھا کہ ان میں جنگ کی استطاعت ہے یا نہیں اور اس جنگ میں کامیابی کا امکان ہے یا نہیں؟ اگر انہوں نے جنگ جاری رکھنے کا فیصلہ کیا تو یہ شرعی جہاد تھا اور ہے اور اس کی مشروعیت ہرگز مشکوک نہیں۔

دوسری غلط فہمی یا مغالطہ یہ دیا جاتا ہے کہ چلیے بیرونی کافر حملہ آور کے خلاف مزاحمت تو جہاد ہے لیکن اپنے مسلمان بھائیوں کے خلاف جنگ کرنا (جو ظاہر ہے اپنے طرزِ عمل کے کچھ دلائل رکھتے ہوں گے) اور مسلمان حکمرانوں اور سپاہیوں کے خلاف لڑنا جہاد کیسے ہوسکتا ہے؟ نصوص قرآن وسنت اور ماضی کی فقہی آراء کی روشنی میں یہاں جمہور علماء کی رائے یہ ہے کہ جو مسلمان کفار کے ساتھ مل کر مسلمانوں کی مسلح مزاحمت ختم کرنے کے لیے ان کے خلاف لڑیں اور ان کے جہاد کو ناکام بنانے کی کوشش کریں، ان کے ساتھ بھی کفار جیسا ہی معاملہ کیا جائے گا اور جس طرح کفار کے قبضے کے خلاف مدافعتی جنگ لڑنا جہاد ہے اسی طرح کفار کے ان گماشتوں کے خلاف لڑنا بھی شرعی جہاد ہے۔

مذکورہ بالا دو امور میں جمہور علماء نے جو موقف اختیار کیا ہے، ہماری رائے میں وہ صحیح ہے اور بعض مغرب زدہ دانشور اس کے خلاف جو دلائل دیتے ہیں وہ بودے ہیں (اگرچہ کفر اور اس کے حمائتیوں کی پروپیگنڈہ مشینری انہیں باوزن بنا کر پیش کرتی ہے) تاہم یہاں ہم اس صحیح موقف کے اظہار تک محدود رہیں گے اور اس کے حق میں دیے جانے والے تفصیلی شرعی دلائل اور غلط نقطۂ نظر کے ابطال کے لیے دیے جانے والے دلائل کے تفصیلی تذکرے سے احتراز کریں گے کیونکہ اس صورت میں یہ مضمون بہت طویل ہوجائے گا اور اس کے لیے چند صفحے کا مضمون نہیں پوری کتاب درکار ہوگی، جو اس وقت ہمارے پیش نظر نہیں۔

جہاد افغانستان سے متفرع ہونے والے مسائل

جب افغانستان میں بیرونی غیر مسلم حملہ آوروں اور ان کے گماشتہ حکمرانوں کے خلاف وہاں کے مسلمانوں کی مسلح مزاحمت شرعی جہاد ہے تو اس سے منطقی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ:

۱- دوسرے مسلمانوں کے لیے جائز اور مستحب ہے (اور بعض علماء فرض کفایہ کا فتویٰ بھی دیتے ہیں) کہ وہ اس جہاد میں ان کی عملی مدد کریں یا خود اس جہاد میں شریک ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پاکستان اور دوسرے مسلم ممالک کے مسلمانوں اور خصوصاً ہمسایہ قبائلی علاقوں کے مسلمانوں کا افغان جہاد میں شریک ہونا یا وہاں کے مجاہدین کی مدد کرنا بھی جائز اور مستحب ہے۔ اور پاکستانی حکومت کا انہیں اس سے روکنا غلط ہے اور امریکی (یعنی غیر مسلم حملہ آور کے) دباؤ پر انہیں روکنا تو نہایت ہی غلط اور غیر شرعی ہے۔

۲- ساری مسلمان حکومتوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس جہاد کی حمایت کریں اور مجاہدین کی مدد کریں۔

۳۔ لہٰذا اسلامی کانفرنس تنظیم (OIC)، مسلم ممالک اور خصوصاً ہمسایہ ممالک اور حکومت پاکستان کی بھی ذمہ داری تھی اور ہے کہ وہ علی الاعلان افغان مجاہدین کی اعانت کریں اور انہیں کامیاب ہونے میں مدد دیں۔ اس کا یہ مطلب بھی واضح ہے کہ حکومت پاکستان کا غیر مسلم بیرونی حملہ آور امریکہ (اور اس کے حلیفوں) کا ساتھ دینا غلط اور غیر شرعی تھا اور ہے۔ اور عملاً بھی یہی کیفیت ہے کہ پاکستانی علماء اور مسلمان عوام کی بہت بڑی اکثریت افغان جہاد کی حمایت کرتی ہے، اسے صحیح جہاد سمجھتی ہے اور امریکی حملے کو غلط سمجھتی ہے لیکن ہماری حکومت (خواہ پرویز مشرف کی ہو یا آصف زرداری کی یا نواز شریف کی) امریکی دباؤ میں آ کر جہاد افغانستان کی حمایت نہیں کرتی۔

امریکہ نے افغانستان پر حملہ کیوں کیا؟

یہ تجزیہ سطحی اور بچگانہ ہے کہ امریکہ نے اسامہ کو ان کے حوالے نہ کرنے کی وجہ سے افغانستان پر حملہ کیا، کروڑوں ڈالر خرچ کیے اور کر رہا ہے اور پچھلے دس سال سے وہاں لڑ رہا ہے اور اپنے آدمی مروا رہا

ہے۔ ہاں! یہ ضرور ہے کہ امریکہ نے افغانستان پر حملہ کرنے کے لیے بہانہ یہی بنایا تھا اور جواز یہی تراشا تھا۔ اصل حقیقت کیا ہے؟ بہت سے مسلمان تجزیہ کاروں کے علاوہ کئی امریکی و یورپی دانشوروں اور تجزیہ کاروں کے نتائج تحقیق بھی سامنے آ چکے ہیں۔ اس پر کئی کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور بہت سی رپورٹیں انٹرنیٹ پر بھی موجود ہیں کہ ۹/۱۱ کا ڈرامہ سی آئی اے اور موساد کی سازش تھی۔ اس کے پیچھے طویل اور سوچی سمجھی منصوبہ بندی تھی۔ اس حادثے سے جو مقاصد پیش نظر تھے ان میں سے چند اہم یہ ہیں:

۱- پس منظر کو ذہن میں رکھیے کہ یورپی قوتوں نے سازشوں سے مسلمانوں کو آپس میں لڑایا (مثلاً ترکوں اور عربوں کو)، انہیں کمزور کیا اور ان کے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ ان کے ایک ہزار برس کے جمع کردہ مادی وسائل کو لوٹا، ان کے اجتماعی زندگی کے ڈھانچے کو تباہ کیا اور مغربی تہذیب کی اساس پر ان کی تشکیل نو کی۔ ان کے پیش نظر یہ تھا کہ زمین تو فتح کی ہے اب مسلمانوں کے دل و دماغ کو بھی فتح کیا جائے تا کہ یہ ہمیشہ ہمارے غلام رہیں اور کبھی سر نہ اُٹھا سکیں۔ اس کے لیے انہوں نے ہر شعبۂ زندگی میں کام کیا۔ سیاست میں اپنی جمہوریت لائے، نظام تعلیم کو بدلا، قانونی اور عدالتی ڈھانچہ تبدیل کیا اور اپنی ثقافت ترغیب و ترہیب سے رائج کی خصوصاً ذہن سازی اور برین واشنگ کے لیے انہوں نے نظام تعلیم کو اپنے قالب میں ڈھالا اور اپنی حکومتوں کے لیے وفادار کارکن تیار کیے (بیوروکریسی) اور بعض طبقات کو جاگیریں دے کر خریدا اور انہیں سیاست میں داخل کیا۔

اس کے باوجود مسلم ممالک میں آزادی کی تحریکیں شروع ہو گئیں۔ اکثر جگہ مسلح مزاحمت ہوئی (ترکی انڈونیشیا، الجزائر) اور بعض جگہ پرامن سیاسی تحریکیں چلیں (ہندوستان، مصر وغیرہ) اللہ نے یورپ کو پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں لڑا کر کمزور کیا اور انہیں مسلم ممالک کو (کسی حد تک) آزادی دینے پر مجبور ہونا پڑا۔ جب وہ انتقال اقتدار پر مجبور ہوئے تو انہوں نے یہ منصوبہ بندی کی کہ اقتدار ان طبقوں کو منتقل کیا جو اس کے پروردہ تھے اور اس کی فکر و تہذیب کے شائق تھے۔ چنانچہ انہوں نے اکثر مسلم ممالک میں اپنی مرضی کی حکومتیں بنوائیں، ان کی پالیسی سازی میں بھرپور مداخلت کی اور مسلم معاشروں کو اپنی مرضی کے مطابق چلانے میں کامیابی حاصل کی۔ ان ساری کوششوں کے باوجود ملائیشیا معاشی طور پر طاقتور ہو گیا، پاکستان اسلامی کردار کو اپناتے ہوئے ایٹمی قوت بن گیا، صدام نے مضبوط فوج کھڑی کر لی اور افغان اپنی مرضی کی ٹھوس اسلامی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ صورتِ حال مغرب کے لیے قابل قبول نہ تھی جس کی سربراہی اب امریکہ کے پاس تھی اور اس کے حقیقی حکمران پس پردہ یہودی تھے۔ چنانچہ امریکہ و یورپ نے امن کا چولہ پہنے ہونے کے باوجود عالم اسلام کے خلاف ننگی جارحیت کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے لیے پہلے عراق کو چنا گیا اور اس سے کویت پر حملہ کرایا گیا، پھر کویت اور سعودی عرب کو بچانے کے

بہانے عراق پرحملہ کیا گیا۔اسی بہانے امریکہ نے سعودی عرب میں فوجیں اتار کر حفاظتی حصار مہیا کرنے کے پردے میں اس کے تیل کے کنوؤں پر قبضہ کرلیا۔ پھرعراق اور ایران کو آپس میں لڑایا اور عراق کو تباہ کرنے کے بعد افغانستان پرحملہ کیا۔اس سے امریکہ و یورپ کے پیش نظر مندرجہ ذیل اہداف تھے:

۱- افغانستان کی اسلامی حکومت کا خاتمہ کیونکہ وہاں ٹھوس اور خالص اسلامی حکومت کا قیام لازماً خطے پر اثر انداز ہوتا اور پاکستان اور وسط ایشیائی مسلم ممالک میں اسلامائزیشن کی ایک بڑی اور مضبوط لہر اُٹھتی۔

۲- پاکستان کو قابو کرنا،اسے کمزور بنانا،توڑنا اور اس کی ایٹمی حیثیت ختم کرنا۔

۳- افغانستان میں بیٹھ کر چین،ایران اور وسط ایشیائی ریاستوں کو دباؤ میں رکھنا۔

۴- افغانستان کی معدنی دولت اور وسط ایشیائی ریاستوں کی تیل کی دولت سے استفادہ اور شرق اوسط کے تیل کے ذخائر پر تصرف کو مستحکم کرنا۔

۹/۱۱ کے حوالے سے مغربی دنیا میں بھی ان کے پیش نظر مخصوص مقاصد تھے مثلاً:

- وہاں موجود مسلمانوں کو دباؤ میں لانا،ان پر پابندیاں عائد کرنا، ان سے مسلم ممالک کو ڈالر بھجوانے کا راستہ بند کرنا اور ان کو اشاعت اسلام اور تعلیمی و دعوتی سرگرمیوں سے روکنا۔

- وہاں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈا کرنا،قرآن جلانا،پیغمبر کے کارٹون بنانا اور مسلمانوں کو دہشت گرد قرار دینا تاکہ وہاں مقامی لوگوں کے اسلام قبول کرنے کا راستہ بند ہو اور تیزی سے پھیلتے ہوئے اسلام کے راستے میں رکاوٹ آئے۔

ان سارے مقاصد کے لیے افغانستان پرحملہ کرنا اور وہاں امریکی اور ناٹو فوجیں اتارنا ضروری تھا چنانچہ یہ کیا گیا اور ان مقاصد کو حاصل کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی۔اسی دوران لیبیا کو بھی تباہ کردیا گیا اور وہاں مرد آہن قذافی کو مار دیا گیا۔ پاکستان اور شام پر یلغار جاری ہے اور یمن و مالی پر بھی حملے کیے جارہے ہیں۔ پاکستان میں امریکہ و یورپ نے اکثر مقاصد حاصل کرلیے ہیں۔ یہاں اس نے پاکستان کے دشمن بھارت اور اسرائیل کو بھی ساتھ ملا لیا اور افغان سرزمین کو استعمال کرتے ہوئے اس نے پاکستان میں اپنا مضبوط نیٹ ورک قائم کر کے کراچی، بلوچستان کوئٹہ اور پشاور میں آگ لگا رکھی ہے۔اس نے پاکستان کو مجبور کیا کہ وہ قبائل پرحملہ کرے تاکہ وہ افغان مجاہدین کی مدد نہ کرسکیں اور خود بھی ان پر ڈرون حملے شروع کر دیے۔اپنی جان بچانے کے لیے وہ جوابی کارروائی پر مجبور ہوگئے۔اس کے ساتھ ہی امریکہ اور بھارت نے دہشت گرد گروپ تیار کیے اور انہیں اسلامی چہرے کے ساتھ پاکستان میں دہشت گرد کارروائیوں پر مامور کیا تاکہ پاکستانی عوام اور طالبان پاکستان میں نفرت پیدا ہو اور پاکستان کی مغربی سرحد مخدوش ہوجائے۔

پاکستان میں یہ سب کچھ نہیں ہوسکتا تھا جب تک یہاں حکومت اس کی مرضی نہ ہو چنانچہ پہلے یہاں جنرل پرویز مشرف کو مسلط کیا، اسے استعمال کرنے کے بعد مغرب پھر جمہوریت کے نام پر زرداری صاحب کو اوپر لایا اور اب نواز شریف کی صورت میں تازہ دم مضبوط گھوڑے کی ان کی ضرورت پوری ہو رہی ہے۔

یہ تھے وہ مقاصد جن کے حصول کے لیے امریکہ نے ۹/۱۱ کا ڈرامہ رچایا اور افغانستان پر حملہ کیا۔ ان میں سے اکثر مقاصد اس نے حاصل کر لیے ہیں لیکن افغان طالبان نے اپنی کس مپرسی کے باوجود ایمان اور جہاد کے بل بوتے پر حریت و عزیمت کی درخشاں تاریخی مثال قائم کر دی ہے اور امریکہ و یورپ کو ناکام و نامراد افغانستان سے نکلنا پڑ رہا ہے۔

پاکستان، دہشت گردی اور طالبان

مندرجہ بالا تناظر کو سامنے رکھتے ہوئے اب پاکستان کی صورتِ حال کے صحیح تجزیے اور اس کے مختلف پہلوؤں کی شرعی حیثیت کا جواب دینا چنداں مشکل نہیں رہتا۔

افغانستان پر امریکی حملے کی حمایت

افغانستان پر امریکی حملے میں پاکستان کی سیاسی اور عسکری قیادت نے (بلکہ اکثر لوگوں کے بقول اس نوع کی پالیسی سازی میں فوج کا کردار زیادہ اہم اور غالب (Dominating) رہا ہے) امریکہ کا ساتھ دیا۔ یہ گویا ایک ہمسایہ دارالاسلام پر ایک غیر مسلم حملہ آور کا ساتھ دینا تھا لہٰذا ہر لحاظ سے غلط اور غیر شرعی تھا اور سیاسی و فوجی حکمت عملی کے لحاظ سے بھی یہ ایک غلط فیصلہ تھا اور پاکستان کے اس جنگ میں ملوث ہونے کے بعد میں جتنے بھی نقصانات ہوئے مثلاً پاکستان میں دہشت گردی کا پھیلنا، طالبان پاکستان کا ابھرنا، ۴۵ ہزار افراد کی شہادت، ملک کی معیشت کا برباد ہونا......ان سب کا ذمہ دار یہی غلط فیصلہ اور اس کے کرنے والے تھے۔

یہ بھی واضح رہے کہ اس میں کوئی حقیقی اکراہ نہ تھا۔ ٹیلی فون پہ دھمکی سن کے کوئی جرنیل یا صدر اپنا ملک اس طرح غیروں کے حوالے نہیں کر دیتا۔ اس فیصلے کی پشت پر جو حقیقی اسباب تھے وہ یہ تھے: مغرب کی ذہنی غلامی، اس سے فکری مرعوبیت بلکہ خوف، بے حمیتی، ڈالروں کی ہوس، اپنے اقتدار اور کرسی کی طوالت ......وغیرہ) بلکہ بعض تجزیہ کاروں کی رائے تو یہ ہے کہ یہ سب سی آئی اے کی پلاننگ تھی یعنی ایٹمی دھماکوں کے بعد کرگل کا واقعہ، نواز شریف کا ہٹایا جانا، سیکولر مشرف کا اقتدار میں آنا، افغانستان کے خلاف جنگ میں امریکہ کا ساتھ دینا...... یہ سب سی آئی اے کی پلاننگ تھی اور اس کے بعد جو کچھ ہوا اور ہو رہا ہے یعنی مشرف کے بعد کیانی اور زرداری اور اب نواز شریف یہ سب تھکے ہوئے گھوڑوں کے بعد تازہ دم گھوڑوں کی تبدیلی

ہے اور سی آئی اے کی پلاننگ کے عین مطابق ہے اور آج بھی وہ اسے کنٹرول کر رہی ہے۔

طالبان پاکستان - شرعی حیثیت

پاکستانی افواج کا امریکہ دباؤ پر قبائلی علاقے کے مسلمانوں پر حملہ کرنا تاکہ وہ جہاد افغانستان میں امریکہ اور ناٹو کے خلاف افغانیوں کی مدد نہ کر سکیں، غلط اور غیر شرعی تھا اور ہے۔ پاکستان کے جمہور علماء کرام نے اس کی مذمت تو کی ہے، اسے غیر شرعی بھی کہا ہے اور اس کے خلاف احتجاج بھی کیا ہے لیکن علماء کرام اور مفتی حضرات نے حکمرانوں کی نہ تکفیر کی ہے، نہ اسے کفر قرار دیا ہے، نہ انہیں مباح الدم کہا ہے اور نہ ان کے خلاف خروج اور بغاوت کو جائز قرار دیا ہے۔ اگر کوئی فرد یا گروہ ایسا کرتا ہے تو یہ اس کی اجتہادی رائے ہے جو غلط بھی ہوسکتی ہے اور صحیح بھی لیکن یہ بہر حال پاکستان کے جمہور علماء کی رائے نہیں ہے۔ انہیں طالبان پاکستان کے مقاصد سے اتفاق اور ہمدردی ہے لیکن انہیں ان کے طریق کار سے اتفاق نہیں ہے۔

حضرت حسین بن علیؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ جیسے عظیم صحابہ کی مظلومانہ شہادت کے بعد اہل سنت کے جمہور علماء نے یہی رائے قائم کی تھی کہ اگر کوئی غیر صالح مسلم حکمران کفر بواح کا ارتکاب بھی کرے تو اس کے خلاف خروج یا بغاوت مباح ہونے کے باوجود ضروری نہیں بلکہ یہ دیکھنا ہوگا کہ اس کی کامیابی کے امکانات کتنے ہیں اور متوقع فوائد کے ساتھ اس کے ممکنہ نقصانات کتنے ہیں؟

چونکہ حقیقت یہ ہے کہ آج کل ریاست کے وسائل اتنے زیادہ ہیں کہ کہ کسی پرائیویٹ گروہ کے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ بزور قوت کسی حکومت کو شکست دے سکے۔ اس لیے کسی غیر صالح مسلم حکومت کے خلاف خروج یا بغاوت کا اجتہادی فیصلہ بھی آسان نہیں تاہم اگر کوئی اخلاص نیت سے یہ فیصلہ کرتا ہے اور اس راہ میں جان قربان کر دیتا ہے تو اس کا اجر اللہ کے ذمے ہے۔ اور امن وامان قائم کرنا اور رکھنا چونکہ ایک مسلم حکومت کی قانونی اور شرعی ذمہ داری ہے لہٰذا اس کوشش میں اگر کوئی حکومتی اہل کار مارا جاتا ہے تو اس کا شہید ہونا بھی ظاہر و باہر ہے۔

ہمارے اس موقف پر کسی کو تعجب نہیں ہونا چاہیے کیونکہ صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ ایک معاملے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قاتل اور مقتول دونوں جنت میں جائیں گے۔ مطلب یہ کہ ایسے حالات ہوسکتے ہیں جن میں دونوں متحارب فریق عنداللہ ماجور ہوں جیسا کہ مشاجرات صحابہ کے بارے میں اکثر علماء اہل سنت کی رائے ہے، واللہ اعلم۔

لیکن ہماری یہ رائے اصولی ہے اور ان مخلصین کے بارے میں ہے جو صدق نیت سے جہاد افغانستان کی حمایت اور پاکستان میں شریعت کا نفاذ چاہتے ہیں۔ رہے وہ لوگ جن کے پیچھے امریکہ و بھارت ہے اور وہ ڈالروں کے لالچ میں اسلامی چہرہ اختیار کر کے پاکستان میں دہشت گردی کرتے اور پاکستانی فوج پر حملے کرتے ہیں، ظاہر ہے وہ غلط ہیں اور ہماری کسی ہمدردی کے مستحق نہیں اور پاکستان کے سیکورٹی اداروں کا حق ہے کہ وہ ان کی سرکوبی کریں۔

جہاد برائے نفاذ شریعت

طالبان پاکستان اگر یہ موقف اختیار کریں کہ انہوں نے پاکستان کی حکومت اور افواج کے خلاف ہتھیار اس لیے اٹھائے ہیں تا کہ پاکستان میں شریعت نافذ کرا سکیں تو پاکستان کے جمہور علماء اس سے متفق نہیں ہیں کیونکہ پاکستان میں اسلامی شریعت کے نفاذ کے لیے پرامن جدوجہد کے راستے کھلے ہیں۔ اگر علماء کرام نے وعظ و تبلیغ اور تعلیم و تربیت کا حق کما حقہ ادا نہیں کیا اور وہ مسلمانوں کی اصلاح نہیں کر سکے اور پاکستان کے لوگ اسلامی تعلیمات پر عمل نہیں کرتے تو اس کے ذمہ دار عوام اور علماء دونوں ہیں۔ اسی طرح علماء اور دینی سیاسی جماعتیں اگر پاکستان میں شریعت نافذ کرنے اور حکمرانوں سے کرانے میں کامیاب نہیں ہو سکیں تو یہ ان کی نالائقی اور کمزوری ہے۔ حکومت پاکستان اور حکمران سیاسی جماعتیں اگر پاکستان میں شریعت نافذ نہیں کرتیں تو وہ گنہ گار ہیں اور یہ ان کی غلطی ہے لیکن اس بنیاد پر نہ ان کی تکفیر کی جا سکتی ہے اور نہ ان کے خلاف جنگ کیونکہ یہ حکمران نفاذ شریعت کے منکر نہیں اور جتنی شریعت ہمارے آئین، قوانین اور اداروں میں موجود ہے، اتنی اکثر مسلم ممالک میں موجود نہیں...... گو بوجوہ یہ غیر موثر ہے اور اس ضمن میں ابھی بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ہماری بڑی سیاسی جماعتیں جو ماضی میں حکمران رہی ہیں، اس وقت بھی ہیں اور شائد آئندہ بھی رہیں گی، مغربی حکومتوں کے زیر اثر ہیں اور خود ان میں بھی سیکولر عناصر کی کثرت ہے اور میڈیا و بیوروکریسی کا رجحان بھی شریعت نافذ کرنے کے خلاف ہے۔ دوسری طرف ملک میں کرپشن، ظلم، ناانصافی اور مہنگائی زوروں پر ہے اور ملک کے اکثر شعبے، تعلیم، میڈیا، معیشت، قانون......وغیرہ مغرب کی الحادی وفکر و تہذیب کے مطابق چلائے جا رہے ہیں اور دینی سیاسی جماعتیں اور دیگر اسلامی عناصر پرامن طریقے سے ان کا توڑ نہیں کر سکے......لیکن اس سب کے باوجود ہمارا موقف یہ ہے کہ جب پرامن جدوجہد کے راستے کھلے ہیں اور آئین، پارلیمنٹ، عدالتیں، حکمران کوئی بھی نفاذِ شریعت کا منکر نہیں ہے تو پھر نفاذِ شریعت بذریعہ مسلح جدوجہد کی اجازت کس اصول کے تحت دی جائے؟ دینی عناصر اگر آج بھی نفاذِ شریعت کے کسی پروگرام پر متحد ہو جائیں، عوام کی تربیت کریں اور انہیں ساتھ ملا لیں تو آج

بھی پرامن طریقے سے ملک میں دین کا غلبہ ہوسکتا ہے۔

ڈرون حملے

امریکہ کو پاکستان کے قبائلی علاقوں پر ڈرون حملوں کا کوئی حق نہیں۔ یہ حکومت وافواج پاکستان کی اخلاقی اور قانونی ذمہ داری ہے کہ وہ یہ حملے رکوائیں۔ اگر وہ پرامن طریقے سے نہیں رکوا سکتے تو قوت سے انہیں روکیں۔ وہ انہیں آسانی گرا سکتے ہیں صرف جرأت مندانہ فیصلے کی ضرورت ہے۔

دہشت گردی کی سرکوبی

اکثر علماء اور دینی جماعتوں کی رائے یہ ہے کہ پاکستان میں دہشت گردی امریکہ و بھارت کے ایجنٹ اور خفیہ گروپ کرا اور کروا رہے ہیں تو حکومت اور افواج پاکستان کی یہ اخلاقی اور قانونی ذمہ داری ہے کہ وہ انہیں قوت سے روکیں اور ان کی سرکوبی کریں اور دہشت گردی کرانے والی قوتوں کو بھی منہ توڑ جواب دیں۔ اگرچہ طالبان پاکستان کا موقف یہی ہے کہ وہ پاکستان میں سویلنز اور عبادت گاہوں (مسجدوں) امام بارگاہوں اور چرچوں، مزاروں، ہسپتالوں اور بازاروں وغیرہ پر حملے نہیں کرتے لیکن بغرض محال اگر وہ ایسا کریں، بلکہ جو بھی ایسا کرے تو یہ غلط اور غیر شرعی ہے اور حکومت پاکستان کو حق حاصل ہے کہ وہ ان کی سرکوبی کرے۔

حکومت کو کیا کرنا چاہیے؟

موجودہ بحران اور ابتر صورت حال کی ذمہ دار حکومت پاکستان اور اس کے غلط فیصلے ہیں لہٰذا حکومت ہی کا فرض ہے کہ وہ حالات سدھارنے کے لیے اقدامات کرے۔ جن فیصلوں کی ضرورت ہے وہ یہ ہیں:

۱- حکومت پاکستان دہشت گردی کے خلاف امریکہ (اور اس کے حلیفوں) کی جنگ سے فی الفور باہر نکل آئے جو دراصل اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جنگ ہے۔ نیز امریکی اور ناٹو افواج کی سپلائی روک دی جائے اور انہیں دی جانے والی ساری سہولتیں ختم کر دی جائیں۔

۲- ایک ڈیڈ لائن دینے کے بعد ڈرون گرا دیے جائیں۔ ڈرون گرانے سے کچھ نہیں ہوگا یہ صرف اعصاب کی جنگ ہے۔ ڈرون نے ایران پر پرواز کی تو ایران نے گرا دیا۔ امریکہ نے کیا کر لیا؟ ہمارے بزدل حکمرانوں اور جرنیلوں نے خود امریکہ کو سر پر چڑھا رکھا ہے اور طرح طرح کے خدشات پال رکھے ہیں۔ وہ تن کر کھڑے ہو جائیں تو کچھ بھی نہیں ہوگا۔

۳- طالبان پاکستان سے مذاکرات کر کے ان کے جائز مطالبات تسلیم کر لیے جائیں۔اسی طرح بلوچستان، خیبر پی کے اور قبائلی علاقوں کے جو لوگ ظلم اور ناانصافی کی وجہ سے ملک چھوڑ گئے ہیں یا لڑ رہے ہیں، ان کے جائز مطالبات مان کر ان سے صلح کر لی جائے۔

۴- امریکہ و بھارت کے افغانی سرزمین کی طرف سے دراندازی کرنے والے خفیہ گروپوں کو (جن میں سے کئی طالبان کی طرح اسلامی چہرہ اپنائے ہوئے ہیں) جو پاکستان میں دہشت گردانہ حملے کرتے ہیں اور اندرون ملک ان کے خفیہ ایجنٹوں اور مقامی انتہا پسندوں کو (جنہیں انہوں نے اپنے ساتھ ملایا ہوا ہے) قوت سے کچل دیا جائے۔

۵- جو سیاستدان، صحافی، دانشور، میڈیا گروپ......امریکی و بھارتی ایجنڈے پر کام کر رہے ہیں اور یوں ان کے ایجنٹ کا کردار ادا کر رہے ہیں، سلیقے اور حکمت عملی سے ان کے چہرے سے نقاب الٹ دیا جائے اور ان کے خلاف سخت قانونی کارروائی کی جائے۔

۶- ملک میں نفاذ شریعت کے لیے اخلاص نیت سے ٹھوس اقدامات کیے جائیں اور ضروری قانون سازی کے علاوہ عوام کی دینی تعلیم و تربیت اور ذہن سازی کے لیے تعلیم، میڈیا اور دعوت و اصلاح کے سارے پرامن ذرائع استعمال کیے جائیں۔

طالبان سے مذاکرات

چونکہ بگاڑ کا آغاز حکومت کی طرف سے ہوا تھا لہٰذا طالبان کو ترغیب دے کر مذاکرات کی میز پر لانے کی کوشش کرنے میں کوئی ہرج نہیں۔ بظاہر حکومت سے ان کے دو ہی بڑے مطالبے ہوں گے: **ایک امریکی** جنگ سے نکلو اور دوسرے شریعت نافذ کرو۔ ظاہر ہے یہ دونوں مطالبے جائز ہیں اور حکومت پاکستان کو انہیں مان کر سنجیدگی سے ان کے تقاضوں پر عمل کرنا چاہیے۔ ملک میں نفاذِ شریعت تحریک پاکستان اور آئین پاکستان کا تقاضا ہے لہٰذا اس پر عمل ہونا چاہیے۔ مسلمان عوام بھی اس سے خوش ہوں گے اور حکومت کی حمایت بڑھے گی۔ علماء اور دینی جماعتوں کی سپورٹ بھی حکومت کو حاصل ہوگی۔ خیبر پی کے اور قبائلی علاقوں میں اس ضمن میں خصوصی اقدامات کرنے میں بھی کوئی ہرج نہیں اور اس حوالے سے جو معاہدے ماضی میں ان سے کیے گئے تھے ان پر صدق دلانہ عمل بھی ضروری ہے۔ دہشت گردی کے خلاف نام نہاد امریکی جنگ سے باہر نکلنے سے پاکستان کے معاشی حالات بھی ان شاءاللہ بہتر ہونا شروع ہو جائیں گے۔

......طالبانائیزیشن، نفاذ شریعت کا صحیح منہاج، مغربی تہذیب کے غلبے کا رد، مطلوبہ حکومتی اقدامات، دینی مدارس، علماء کرام اور دینی جماعتوں کے لیے صحیح لائحہ عمل......اگلے شمارے میں ان شاءاللہ۔

تعلیم و تربیت　　ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی ☆

علامہ شبلی کے تعلیمی افکار (آخری قسط)

یہ بات بخوبی معروف ہے کہ علامہ شبلی کے زمانہ میں مسلمانوں میں جدید تعلیم کی اشاعت کے لیے کوششیں زوروں سے جاری تھیں، ان میں رفتہ رفتہ اس کا رواج بڑھ رہا تھا۔ اس باب میں سرسید تحریک کلیدی کردار ادا کر رہی تھی اور عصری تقاضوں اور ملی ضروریات کے پیش نظر جدید تعلیم کے اکتساب پر کافی زور دیا جا رہا تھا، اس صورتِ حال میں اگر کسی گوشہ سے مشرقی تعلیم کی توسیع و ترقی یا جدید جامعات میں اس تعلیم کے اہتمام سے متعلق کوئی آواز اُٹھتی یا سرکاری وغیر سرکاری سطح پر اس کے لیے کوئی پروگرام تشکیل دیا جاتا تو بعض لوگ یہ خیال ظاہر کرتے اور اس سلسلہ میں مضامین بھی لکھتے تھے کہ اس سے جدید تعلیم کی اشاعت متاثر ہوگی جس کی ضرورت اب بڑھ گئی ہے اور جس میں مسلمان اب دلچسپی لینے لگے ہیں۔ علامہ شبلی اس نقطہ نظر کو صحیح نہیں سمجھتے تھے، ان کا یہ خیال تھا کہ مشرقی تعلیم اور جدید تعلیم کی راہیں الگ الگ ہیں، اول الذکر کی توسیع و اشاعت کے لیے کوششیں دوسری کے لیے ہرگز حارج نہ ہوں گی، دوسرے مسلمانوں نے جدید تعلیم کی اہمیت و افادیت کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے اور وہ اس جانب راغب بھی ہو رہے ہیں، لیکن ان سب کے باوجود ان کے لیے مشرقی و مذہبی تعلیم کے اہتمام کی ضرورت اپنی جگہ مسلم ہے اور یہ ضرورت ہمیشہ باقی رہے گی۔ جدید دور میں اس کی مثالیں موجود ہیں کہ انگریزی یا جدید تعلیم کے میدان میں سرگرمیوں کے ساتھ اعلیٰ پیمانہ پر مذہبی تعلیم کا اہتمام بھی جاری ہے۔ یورپ میں جدید تعلیم کافی ترقی پر ہے لیکن ان میں ایک وسیع طبقہ ایسا موجود ہے جو مذہبی تعلیم کی نشر و اشاعت میں مصروف ہے اور اس طرح وہ مذہبی تعلیم اور مذہبی لٹریچر کے تحفظ کی خدمت انجام دے رہا ہے۔ خود اپنے ملک میں آریہ کی مثال موجود ہے۔ وہ انگریزی تعلیم میں کافی ترقی پر ہیں۔ دوسری جانب وہ گروکل بھی قائم کر رہے ہیں جس میں ان کے مذہب اور سنسکرت کی تعلیم اعلیٰ پیمانہ پر جاری رہتی ہے۔ ان تعلیم گاہوں سے اصل مقصود ان کے مذہب و لٹریچر کی اشاعت و حفاظت ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ان اداروں نے آریوں میں انگریزی تعلیم کو کم کر دیا ہے یا ان کی انگریزی تعلیم پر کوئی برا اثر ڈالا ہے۔ ان کے خیال میں اس سوال کا جواب نفی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ دراصل ان باتوں سے علامہ شبلی کا مقصود یہ گوش گزار کرنا تھا کہ مسلمانوں میں جدید تعلیم کی ترویج کی ضرورت و افادیت بالکل واضح ہو چکی ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مذہبی تعلیم یا دینی اداروں کی ضرورت باقی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ضرورت علیٰ حالہ باقی ہے اور آئندہ بھی باقی رہے گی۔ ان کا واضح موقف یہ تھا کہ مسلمانوں کے لیے مشرقی و مذہبی تعلیم کی حیثیت ریڑھ کی ہڈی کی ہے۔ مسلم

معاشرے کے لیے اس تعلیم کے ماہرین کی ضرورت ناگزیر ہے۔خواہ جدید تعلیم کی طلب کتنی ہی بڑھ جائے۔مشرقی و مذہبی تعلیم کا تعلق مسلمانوں کی صرف ذاتی و انفرادی زندگی سے نہیں ہے بلکہ ان کی اجتماعی زندگی کے بہت سے مسائل بھی اس سے وابستہ ہیں۔وہ بہت ہی صاف لفظوں میں فرماتے تھے:

> اگر یورپ کو بایں دنیا طلبی پادریوں کی حاجت ہے اور اگر آریوں کو بایں انگریزی خوانی گروکل کی ضرورت ہے تو مسلمانوں کو بھی عربی تعلیم و مذہبی تعلیم کی ضرورت ہے اور یہ تعلیم اس وقت تک باقی رہے گی جب تک مسلمانوں کی قوم کا باقی رہنا ضروری ہے[۱]۔

اس تعلیم کے ضروری ہونے کی وجہ بھی انہوں نے بیان کی کہ چاہے یہ کیسی ہی گئی گزری حالت میں ہو اس میں ایسی چیزیں شامل ہیں جو مسلمانوں کی قومیت (یعنی ملی زندگی) کی روح ہیں اور ان کے مذہب، مذہبی لٹریچر اور تہذیب و تمدن کے تحفظ و استحکام کی ضامن بھی بنتی ہیں۔خود ان کے اپنے الفاظ ہیں:

> میرا ہمیشہ سے یہ خیال ہے اور اس میں نہایت مضبوطی سے اس پر قائم ہوں کہ مسلمان مغربی علوم میں گو ترقی کے کسی مرتبہ تک پہنچ جائے لیکن جب تک ان میں مشرقی تعلیم کا اثر نہ ہو، ان کی ترقی مسلمانوں کی ترقی نہیں کہی جا سکتی۔بے شبہ مشرقی تعلیم کی جو موجودہ اسکیم ہے، وہ نہایت ابتر و غیر ضروری ہے۔لیکن اسی تعلیم میں ایسی چیزیں بھی ہیں جو مسلمانوں کی قومیت کی روح ہیں اور جس تعلیم میں اس روحانیت کا مطلق اثر نہ ہو وہ مسلمانوں کے مذہب، قومیت، تاریخ، کسی چیز کو بھی زندہ نہیں رکھ سکتی[۲]۔

آخر میں اس حقیقت کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ علامہ شبلی کے تعلیمی افکار کا ایک بہت ہی قیمتی پہلو یہ ہے کہ انہوں نے تعلیم کو مسلمانوں کی ملی و اجتماعی ضروریات سے مربوط کیا اور یہ انقلابی فکر پیش کی کہ مسلمانوں کی تعلیم سے مطلوب صرف انفرادی زندگی کی تعمیر نہیں بلکہ ان کی مذہبی و ثقافتی و ملی ضروریات کی تکمیل اور بہت سے اجتماعی مسائل کا حل ان میں اعلیٰ تعلیم کے فروغ پر منحصر ہے۔ان کی نظر میں تعلیم کی ایک بہت بڑی غرض و غایت یہ ہے کہ دین کی دعوت اور اسلامی احکام و تعلیمات کی تشریح و ترجمانی کے لیے افراد تیار ہوں۔یعنی مسلمانوں کی تعلیم کا نظام اس طور پر مرتب کیا جائے کہ اس کے فیض سے ایسے باصلاحیت افراد پیدا ہوں جو نہایت خوش اسلوبی سے دعوت دین کا فریضہ انجام دے سکیں اور اسلام و اسلامی اقدار کی موثر ترجمانی کر سکیں۔ان میں ایسی اہلیت نشو و نما پائے کہ وہ اسلام پر اعتراضات کا مدلل انداز میں جواب دے سکیں اور عصری تقاضوں کے مطابق صحیح و مستند مذہبی لٹریچر تیار کر سکیں۔علامہ شبلی نے اپنی تحریروں میں تعلیم کے ان مقاصد کی تکمیل پر جو زور دیا اس کا ایک خاص پس منظر تھا، اس وقت

ملک کے مختلف حصوں میں آریوں کی تحریک زوروں پر تھی، انہوں نے خاص طور سے دیہی علاقوں میں اپنے مذہبی عقائد ورسوم کی تعلیم وتبلیغ کا جال پھیلا رکھا تھا، نومسلموں میں اسلام کے بارے میں غلط فہمی پیدا کرنا اور اسلام کے خلاف ورغلانا ان کی سرگرمیوں کا نہایت اہم پہلو تھا۔ بقول علامہ شبلی اس تحریک کے رہنما اپنی جاں فشانی، ایثار نفسی، قناعت وخودداری سے لوگوں کو متاثر کرتے تھے، ان کے واعظین ومبلغین بڑے تعلیم یافتہ اور سادہ طرز زندگی اور فقیرانہ روش اختیار کرتے تھے، وہ گاؤں گاؤں میں پھرتے تھے، چنے چبا کر پیٹ بھر لیتے تھے اور رات کو درخت کے نیچے سو رہتے تھے (۳)۔

اپنے زمانہ کے مخصوص حالات میں وہ آریوں کے ان اوصاف سے بہت متاثر تھے اور وہ یہ برملا بیان فرماتے کہ مسلم معاشرہ میں بھی ایسے جفاکش، ایثار پسند اور مخلص علماء کی ضرورت ہے جو دیہات میں پھیل جائیں اور اطراف میں اپنے مستقل تعلیمی وتبلیغی مراکز قائم کریں۔ اس مقصد کے تحت علامہ شبلی نے مدارس میں جن امور کے اہتمام پر خاص زور دیا وہ یہ تھے:

☆ عربی دانوں کے لیے انگریزی وسنسکرزبان کی اعلیٰ تعلیم کا اہتمام۔

☆ مدارس میں مبلغین ودعاۃ کی تربیت کے لیے شعبہ اشاعت وحفاظت اسلام قائم کرنا۔

☆ مختلف اضلاع میں اس شعبہ کی شاخیں قائم کرکے مستقل واعظین مقرر کرنا تاکہ وہ دیہاتوں میں ایک ایک دو دو مہینہ رہ کر اسلامی عقائد واحکام کی تعلیم دیں اور خاص طور سے نومسلموں میں وہ دعوت و تربیت کا کام کریں۔

☆ مستقل واعظین ومبلغین کا نظم نہ ہونے تک اس کا ایک عارضی متبادل نظم قائم کیا جائے اور اس کے لیے ائمہ وموذنین کو تربیت دی جائے۔ ان کے لیے اردو کا برس دو برس کا کورس بنایا جائے اور اردو پڑھنے والے نوجوانوں کو قرآن پاک کے ساتھ اردو میں مسائل وعقائد کی سادہ تعلیم دے کر دیہاتوں کی مسجدوں میں پھیلا دیا جائے۔ یہ مسجدوں میں بچوں کو تعلیم بہم پہنچائیں اور لوگوں میں اسلام کی تبلیغ بھی کرتے رہیں (۴)۔

علامہ شبلی صرف گفتار کے نہیں بلکہ کردار کے بھی غازی تھے۔ انہوں نے ندوۃ العلماء میں اپنی تجاویز کو ابتدائی شکل میں عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی اور صیغہ اشاعت وحفاظت اسلام کے نام سے ۱۹۰۸ء میں ایک علیحدہ شعبہ قائم کیا۔ اس کے سیکرٹری مولانا شاہ سلیمان پھلواری مقرر ہوئے، لیکن بعض وجوہ سے اس شعبہ کا کام آگے نہیں بڑھ سکا (۵)۔ پھر انہوں نے اس مقصد سے ندوہ سے باہر ایک مجلس اشاعت وحفاظت اسلام قائم کی اور سید سلیمان ندوی کو شریکِ ناظم کے طور پر مقرر کیا۔ انہوں نے اس کی

سرگرمیوں کو کافی آگے بڑھایا، جس میں نومسلموں کی مردم شماری، ان کے احوال وکوائف کے باب میں معلومات کی فراہمی، ان کی آبادیوں میں احکام اسلام کی ترویج واشاعت کا اہتمام اور مضامین، خطوط، اشتہارات و پمفلٹ کے ذریعے مسلمانوں میں ان کے مسائل کے تئیں بے داری پیدا کرنا اور ان تمام کاموں کے لیے اہل علم واصحاب خیر سے تعاون کی دردمندانہ اپیل کرنا شامل ہیں۔ یہ تمام کام علامہ شبلی کی نگرانی وہدایت میں انجام پاتے رہے(۶)۔

ان سب سے مقصود یہ تھا کہ ایک ایسا مرکز وجود میں آئے جہاں ایسے داعیان دین تیار ہوں جو مذہبی ومشرقی تعلیم کے ساتھ علاقائی زبانوں اور عصری مضامین سے بخوبی واقف ہوں تاکہ اسلام کی اشاعت اور علمی سطح پر آریہ مبلغین سے مقابلہ کے لیے وہ مفید وکارگر ثابت ہوں، ان کے پیش نظر یہ بھی تھا کہ اس مرکز کے زیر اہتمام دیہات وقصبات کی بالخصوص نومسلم آبادی میں احکام اسلام کی ترویج کا اہتمام کیا جائے۔

دین کی دعوت اور اسلام کے دفاع کے لیے باصلاحیت افراد تیار کرنے سے متعلق ان تجاویز و اقدامات سے قطع نظر علامہ شبلی مبلغین اسلام (جنہیں وہ خدام الدین کہتے تھے) کی تربیت کے پورے نظام کو مدارس سے منسلک کرنے کے حق میں تھے۔ درحقیقت وہ خدام الدین کی تربیت کو مدارس کے نظام کا ضروری جز بنانا چاہتے تھے اور اس مقصد سے ان کی درسیات اور طریقہ تدریس میں مناسب ترمیم و اضافہ بھی چاہتے تھے۔ مدارس میں عربی وفارسی اور اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی وسنسکرت کی تعلیم پر زور دینے کی ایک خاص وجہ یہ تھی کہ ان اداروں کے طلبہ مختلف پہلو سے دین کی خدمت اور اسلام کی تبلیغ و ترجمانی کے لیے تیار ہوجائیں۔ آریوں سے مقابلہ کے لیے اور ان کی تحریک کے خطرات کے ازالہ کے لیے علامہ شبلی کے ذہن میں مبلغین کی ایک ایسی جماعت کا نقشہ تھا جو محنتی وجفاکش ہو، ایثار وقناعت جیسے اوصاف سے متصف ہو اور سادہ مذہبی زندگی میں رچی بسی ہو۔ اس باب میں وہ اس خیال کے حامل تھے کہ دیہات کے کسی مدرسہ کو خدّام الدین کی تربیت کا مرکز بنایا جائے تو زیادہ بہتر ومفید رہے گا(۷)۔

یہاں یہ واضح رہے کہ علامہ شبلی نے خدام الدین کی تیاری کے لیے سادگی، ایثار وقناعت اختیار کرنے کی ترغیب دیتے ہوئے بار بار گروکل کے تربیت یافتہ آریہ مبلغین سے سبق حاصل کرنے پر زور دیا ہے۔ اس پر مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم کا تبصرہ بہت مناسب معلوم ہوتا ہے، خود ان کے الفاظ میں ملاحظہ کریں:

ہندوستان کے مخصوص حالات میں مولانا پر اس وقت گروکل کا تصور چھایا ہوا تھا ورنہ

رسول اکرم ﷺ اور صحابہ کرامؓ سے بڑھ کر کس کی زندگی میں ایثار و سادگی اور قناعت کا نمونہ ملے گا(۸)۔

خدام الدین کی تیاری کے لیے ان کی نظر سب سے پہلے مدرسۃ الاصلاح پر پڑی جو اس وقت مجلس اصلاح المسلمین سے مدرس کی صورت میں منتقل ہو کر مولانا حمید الدین فراہی کی سرپرستی میں مولانا محمد شفیع کے زیر نظامت ترقی کے منازل طے کر رہا تھا۔ یہ مدرسہ سرائے میر (اعظم گڑھ) کے قریب ایک دیہی علاقہ میں تھا اور اپنی سادگی و اصول پسندی کے لیے معروف تھا، انہوں نے اپریل ۱۹۱۰ء میں مولانا فراہی کے نام ایک خط میں یہ تجویز رکھی کہ اس مدرسہ کو''گورکل'' کے طور پر خالص مذہبی مدرسہ بنانا چاہیے، یعنی سادہ زندگی اور قناعت و مذہبی خدمت مطمع زندگی ہو۔ مولانا فراہی کے نام علامہ شبلی کے خط کا یہ حصہ بہت ہی مشہور ہے اور اکثر اس کا حوالہ دیا جاتا ہے:

> کیا تم چند روز سرائے میر کے مدرسہ میں قیام کر سکتے ہو اور مَیں بھی شائد آؤں اور اس کا نظم و نسق درست کر دیا جائے، اس کو گروکل کے طور پر خالص مذہبی مدرسہ بنانا چاہیے، یعنی سادہ زندگی اور قناعت اور مذہبی خدمت مطمح زندگی ہو(۹)۔

یہ قطعی طور پر معلوم نہیں کہ مولانا فراہی نے اس کا کیا جواب دیا لیکن یہ بات یقینی معلوم ہوتی ہے کہ ان دونوں علامہ شبلی خدام الدین کی جماعت کے قیام کے تئیں بہت سنجیدہ و سرگرم تھے اور وہ جلد از جلد کسی مدرسہ میں اس کی داغ بیل ڈالنا چاہتے تھے، چنانچہ ندوۃ العلماء میں انہوں نے اس کی بنیاد ڈال دی، کچھ طلبہ اس کام کے لیے رضا مند ہو گئے۔ ان کو باقاعدہ اس جماعت میں داخل کرنے سے قبل ان کے والدین کی رضا مندی بھی حاصل کی۔ ان طلبہ کے لیے روزمرہ زندگی کا یہ اصول وضع کیا گیا کہ وہ کھانے پینے اور رہن سہن میں سادگی اختیار کریں گے، زمین پر سوئیں گے اور احکام اسلامی کی پوری پابندی کے ساتھ تقویٰ و قناعت کی زندگی کو اپنا شعار بنائیں گے(۱۰)۔

خدام الدین کی تربیت کا یہ سلسلہ جنوری ۱۹۱۲ء کے شروع میں قائم ہوا اور اس کے تقریباً ایک ماہ بعد ہی مولانا فراہی کے نام خط میں اس جماعت کے قیام پر اظہار مسرت کرتے ہوئے مختصراً اس کی کارکردگی بیان فرمائی اور یہ امید بھی ظاہر کی کہ تربیت کے بعد یہ طلبہ دیہات میں اشاعت اسلام کے لیے کارگر ثابت ہوں گے(۱۱)۔

۱۹۱۳ء میں ندوہ سے علامہ شبلی کی علیحدگی کے بعد ظاہر ہے کہ خدام الدین کی تربیت کا یہ سلسلہ منقطع ہو گیا لیکن اس کی ضرورت و افادیت ان کے ذہن میں اس قدر رچ بس گئی تھی کہ وہ اس سے غافل نہ

رہے۔ندوہ کی ذمہ داری سے سبک دوشی کے بعد جب انہوں نے اعظم گڑھ کو اپنی مصروفیات کا مرکز بنایا تو پھران کے ذہن میں یہ خیال تازہ ہوا کہ مدرسۃ الاصلاح میں خدام الدین کی تربیت کا اہتمام کیا جائے اور اس مدرسہ کے نظام کو اس نہج پر ڈھالا جائے کہ یہ ایسے باصلاحیت داعیانِ دین کی تیاری کا مرکز بن جائے جو بہتر و موثر انداز میں اسلامی اقدار و تعلیمات کی تشریح و ترجمانی کی خدمت انجام دے سکیں اور اسلام مخالف سرگرمیوں کا تدارک کرسکیں۔۲۳/اکتوبر ۱۹۱۳ء کو مولانا فراہی کے نام ان کے تحریر کردہ خط سے یہ صاف واضح ہوتا ہے کہ وہ یہ چاہتے تھے کہ سرائے میر (مدرسۃ الاصلاح) یا اعظم گڑھ (دارالمصنفین) کسی ایک کو ایسا مرکز بنایا جائے کہ اس میں دینی و دنیوی دونوں اعتبار سے اعلیٰ تعلیم کا اہتمام ہو۔خدام الدین کی تربیت کا باقاعدہ نظم ہو اور ایک معقول کتب خانہ بھی قائم ہو[۱۲]۔

بعد میں اکتوبر ۱۹۱۴ء میں مولانا مسعود علی کے نام ان کے تحریر کردہ خط سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ مدرسۃ الاصلاح کو ابتدائی تعلیم کا مرکز اور دارالمصنفین کو درجہ تکمیل بنانا چاہتے تھے،اس طرح ایک پوری جامعہ اسلامیہ یا یونیورسٹی کی اعلیٰ تعلیم کا نقشہ ان کے ذہن میں تھا،جیسا کہ ان کے الفاظ سے مترشح ہوتا ہے۔

> دارالمصنفین درجہ تکمیل،سرائے میر کا درجہ ابتدائی،پورا جامعہ اسلامیہ کا مصالحہ ہے،
> کام کرنے کی ضرورت ہے[۱۳]۔

مسلمانوں کی تعلیم،مدارس کے نظام تعلیم و تربیت اور تعلیم کو بامقصد بنانے سے متعلق علامہ شبلی کی ان تجاویز کی اہمیت وافادیت سے کون انکار کرسکتا ہے لیکن ان کی آخرالذکر تجویز (خدام الدین کی تیاری کو مدارس کے نظام تعلیم و تربیت کا ضروری جز بنایا جائے) ابھی منصوبہ بندی یا عمل آوری کے ابتدائی مرحلہ میں تھی کہ وہ ۱۸/نومبر ۱۹۱۴ء کو اس دارفانی سے رخصت ہوگئے (اللھم اغفر وارحم وانت خیرالراحمین) اور ان کے اپنے بنائے ہوئے نقشہ کے مطابق یہ کام آگے نہ بڑھ سکا۔

اوپر کی تفصیلات سے یہ بخوبی واضح ہوتا ہے کہ علامہ شبلی تعلیم کا بہت ہی جامع تصور رکھتے تھے،ان کی نظر میں تعلیم نہ صرف یہ کہ ہر شخص کی انفرادی زندگی کی تعمیر و ترقی کا بہترین وسیلہ ہے بلکہ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کی بہت سی ضروریات اس سے وابستہ ہیں۔اسی لیے وہ مسلمانوں کے لیے مختلف علوم وفنون کے اکتساب کو ضروری سمجھتے تھے اور ان کے لیے تعلیمی نظام کی تشکیل میں عصری تقاضوں کی رعایت کو کافی اہمیت دیتے تھے۔ان سب کے علاوہ مذکورہ مباحث سے ان کے تعلیمی افکار کا ایک بہت اہم پہلو یہ سامنے آتا ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے مخصوص حالات اور غیر مسلم مبلغین کی ریشہ دوانیوں کے پیش نظر مسلمانوں کے

تعلیمی نظام بالخصوص مدارس کے تعلیمی سلسلہ کو ایک عظیم مقصد سے مربوط کرنا چاہتے تھے اور وہ تھا اسلام کی تبلیغ و اشاعت، اسلامی احکام و تعلیمات کی بہتر تشریح و ترجمانی اور اسلام مخالف عناصر سے مقابلہ (یا فی الجملہ دین کی خدمت) کے لیے باصلاحیت مخلص، محنتی و جفاکشی افراد تیار کرنا، اس میں کوئی دورائے نہیں کہ وہ مدارس کو ان افراد کی تعلیم و تربیت کا بہترین مرکز سمجھتے تھے اور اس نقطہ نظر سے ان کے تعلیم و تربیت کے نظام میں اصلاح و ترقی کی جانب اہل مدارس کو بار بار متوجہ کرتے رہے۔ بلاشبہ برصغیر کے موجودہ حالات اور ملت اسلامیہ کو درپیش مسائل کے سیاق میں علامہ شبلی کے یہ افکار بڑی اہمیت و معنویت رکھتے ہیں اس لیے کہ موجودہ صورت حال میں مسلم معاشرہ کو مختلف علوم و فنون خاص طور سے اسلامی و عصری علوم کے ماہرین کی ضرورت اور زیادہ بڑھ گئی ہے۔ اسلام اور اسلامی نظام حیات پر نئے نئے اعتراضات وشبہات سامنے آرہے ہیں، قرآن کریم، پیغمبر آخرالزماں ﷺ اور شریعت اسلامیہ کے خلاف پروپیگنڈہ کی مہم تیز سے تیز تر ہوتی جارہی ہے اور اس کام میں ''الکفر ملۃ واحدۃ'' کے اصول پر تمام مخالف قوتیں مجتمع اور انتہائی سرگرم ہوگئی ہیں۔ ایسے سنگین حالات میں اسلام کے دفاع اور دین کی خدمت میں منہمک ہوجانے والوں کی ضرورت کس قدر بڑھ گئی ہے، وضاحت کی محتاج نہیں۔ واقعہ یہ کہ علامہ شبلی نے اپنے زمانہ کی صورت حال میں اس بات پر خاص زور دیا کہ مسلمانوں کے لیے نہ صرف مشرقی تعلیم کافی ہے اور نہ محض جدید تعلیم سے آراستہ ہونا ان کی انفرادی واجتماعی ضروریات کی کفایت کرسکتا ہے۔ بلکہ ان کے لیے ایک ایسا تعلیمی نظام درکار ہے جو مرکب ہو، مشرقی وعصری تعلیم سے [۱۴]۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم نے علامہ شبلی کے اس نقطہ نظر پر تبصرہ کرتے ہوئے بجا فرمایا:

> دراصل وہ دین و دنیا کی خلیج پاٹنا اور قدیم وجدید کا ڈانڈا ملانا چاہتے تھے، کیونکہ ان کے نزدیک موجودہ دور میں نہ محض قدیم تعلیم سے مسلمانوں کے مسائل اور ضرورتوں کا حل ممکن ہے اور نہ صرف جدید تعلیم ہی ان کے دکھ اور درد کی دوا ہے۔ دونوں کے مجموعے اور آمیزش ہی میں ان کے مسائل اور پریشانیوں کا علاج ہے [۱۵]۔

خلاصۂ بحث

مختصر یہ کہ آج کے حالات میں علامہ شبلی کے تعلیمی افکار ونظریات اور زیادہ برمحل و بامعنی معلوم ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ مسلمانوں کے اجتماعی وملی مسائل کے حل کے لیے دینی وعصری تعلیم میں امتزاج اور دونوں تعلیم کے فیض یافتگان میں تال میل اور ربط وتعاون کی ضرورت اب پہلے سے بہت زیادہ بڑھ گئی ہے اور دوسری جانب اس امتزاج اور ربط وتعاون کا مسئلہ مزید پیچیدہ ہوتا جارہا ہے۔ اہم بات یہ کہ علامہ

شبلی نے نہ صرف یہ کہ اس مسئلہ کی جانب توجہ دلائی بلکہ وقت کے تقاضے کے مطابق اس کے حل کے لیے تجاویز بھی پیش کیں۔اس کے علاوہ یہ بات بھی کچھ کم اہم نہیں کہ انہوں نے مدارس کی تعلیم کو اس طور پر مرتب و منظّم کرنے پر زور دیا کہ ان اداروں سے ایسے باصلاحیت افراد پیدا ہوں جو اسلام کی اشاعت، دین کی دعوت اور اسلامی احکام و تعلیمات کی تشریح و ترجمانی کی خدمت بہتر طور پر انجام دے سکیں۔اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ برصغیر بلکہ پوری دنیا کے حالات کا تقاضا یہی ہے کہ مسلمانوں میں باصلاحیت، مخلص و محنتی خدام الدین زیادہ سے زیادہ تعداد میں پیدا ہوں اور بلاشبہ علامہ شبلی کا یہ تاثر بجا ہے کہ دینی مدارس ہی اس طرح کے افراد کی تیاری کے بہترین مراکز ثابت ہوسکتے ہیں۔

حوالہ جات وحواشی

١) مقالات شبلی، ج:٣،ص: ١۴٦-١۴٧
٢) ایضاً، ج:٣،ص: ١۴٩
٣) شبلی نعمانی، سفرنامہ روم ومصروشام (اعظم گڑھ، مطبع معارف، ١٩۴٠ء)، ص:١٨٦-١٨٧
۴) حیات شبلی، ص:۵٦١-۵٦٢
۵) ایضاً، ص:۵٦٢-۵٦۴؛ مسلمانوں کی تعلیم، ص:١۵۵-١۵٧
٦) ایضاً، ص:۵۵٧-۵۵٨
٧) اصلاحی، مسلمانوں کی تعلیم، ص:١۵٧-١۵٨
٨) اصلاحی، مسلمانوں کی تعلیم، ص:١٦٠
٩) مکاتیب شبلی (اعظم گڑھ، دارالمصنفین، ١٩٧١ء)، ج:٢،ص:٣٣ (مکتوب نمبر ۵٠)
١٠) حیات شبلی، ص:۵٧٦
١١) مکاتیب شبلی، ج:٢،ص:٣٦ (مکتوب نمبر ۵۵)
١٢) ایضاً ج:٢،ص:۴٧ (مکتوب نمبر ٦٨)
١٣) ایضاً، ج:٢،ص:١٣۵ (مکتوب نمبر ٢۵)
١۴) مقالات شبلی، ج:٣،ص:١٦٣
١۵) اصلاحی، مسلمانوں کی تعلیم، ص:١٨٠

تعلیم و تربیت مدیر

دینی مدارس اور مطالعۂ مغرب

جمعیت طلبہ عربیہ نے لاہور میں پاکستان بھر سے ۲۵ منتخب طلبہ کو ایک ہفتے کی تحقیقی تربیت کے لیے جمع کیا اور سیکولرزم کو اس کورس کا مرکزی موضوع قرار دیا۔ ہم منتظمین کی اس بیدار ذہنی پر ان کو مبارک باد دیتے ہیں کہ انہوں نے اس موضوع کا انتخاب کیا جس کی دینی مدارس کو اشد ضرورت ہے۔ ہمیں بھی اس ورکشاپ میں 'مسلم معاشرے پر سیکولرزم کے اثرات' کے موضوع پر گفتگو کا موقع ملا۔

منجملہ دوسری باتوں کے ہم نے کہا کہ بدقسمتی سے سیکولرزم ہمارے دینی مدارس میں بھی گھس آیا ہے اور وہ یوں کہ انگریز نے مسلمانوں کو ہمیشہ اپنا غلام رکھنے کے لیے ہندوستان میں ان کا نظام تعلیم ختم کر دیا۔ اوقاف ختم کر دیے گئے، فارسی ذریعۂ تعلیم ختم کر دیا گیا اور فارسی دانوں کے لیے ملازمتوں کے دروازے بند کر دیے گئے۔ اس کی بجائے انگریزی کو اور مغربی علوم کو رواج دیا گیا اور تعلیمی اداروں کو مغربی طرزِ معاشرت میں ڈھالا گیا۔ یوں پہلے انگریز کے قائم کردہ تعلیمی ادارے اور بعد میں مغرب زدہ مسلمانوں کے تعلیمی ادارے (جیسے علی گڑھ) ایسے طلبہ پیدا کرنے لگے جو مغربی تہذیب کے شائق اور اس سے مرعوبانہ ذہن کے حامل تھے۔

اُس وقت علماء نے سوچا کہ اگر تعلیم کا یہی حال رہا تو مسجدوں کو امام اور خطیب اور معاشرے کو نکاح، طلاق اور جنازے کے لیے علماء بھی میسر آنا بند ہو جائیں گے چنانچہ انہوں نے مادی وسائل نہ ہونے کے باوجود بھوکے رہ کر اور گھاس پھونس کے حجروں میں بیٹھ کر طلبہ کو قرآن وسنت کی تعلیم دینا شروع کی۔ یہ بڑی اولوالعزمی اور ایثار کی بات تھی جس کے لیے ہم ان جلیل القدر علماء کرام کے شکرگزار ہیں اور ان کی بلندیٔ درجات کے لیے دعا گو ہیں لیکن وہ ایک عارضی مرحلہ تھا جو گزر گیا اور اس میں بھی مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور مولانا قاسم نانوتویؒ نے کوشش کی تھی کہ دینی علوم کے طلبہ علوم دنیاوی سے محروم نہ رہیں چنانچہ علی گڑھ سے ایک معاہدہ کیا گیا کہ مدرسہ کے طلبہ فراغت کے بعد دو سال کے لیے علی گڑھ جائیں گے اور علی گڑھ کے فارغ التحصیل طلبہ دیوبند آئیں گے اور اس غرض سے دیوبند کے کورس میں دو سال کی تعلیم کم کر دی گئی لیکن بدقسمتی سے اس منصوبے پر عمل نہ ہو سکا۔

قیامت پاکستان کے بعد وہ حالات بدل گئے۔ اب معاشرہ مسلمانوں کا تھا، حکومت بھی ان کی تھی تو اب دینی مدارس کو بھی اپنا نظام بدلنا چاہیے تھا لیکن علماء نے اس طرف توجہ نہ دی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ملک کا نظم ونسق وہ لوگ چلا رہے ہیں جو جدید تعلیم گاہوں سے سیکولر تعلیم لے کر نکل رہے ہیں اور دینی مدارس کے طلبہ کے لیے آج بھی مسجدوں اور مدرسوں کے علاوہ کوئی جائے پناہ نہیں کیونکہ دینی مدارس آج

بھی انگریزی زبان اور معاصر دنیاوی علوم پڑھانے کے لیے تیار نہیں، حالانکہ ماضی میں وہ پڑھایا کرتے تھے۔ اس طرح مدارس خود دین و دنیا کی تعلیم میں تفریق کر رہے ہیں اور اپنی دنیا کو انہوں نے انگریزی پڑھنے والے سیکولر ذہن کے لوگوں کے حوالے کر رکھا ہے اور خود مسجدیں اور مدرسے سنبھال کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ پاکستانی معاشرے اور ریاست کو دین سے دور رکھنے میں اس پالیسی کا بڑا ہاتھ ہے لہٰذا دینی مدارس کو چاہیے کہ وہ دین و دنیا کی تفریق پر مبنی اس نظام تعلیم کی فوراً اصلاح کریں اور اپنے طلبہ کو ایسی تعلیم دیں جس سے وہ مذہبی امور کے علاوہ دنیاوی امور میں بھی دسترس رکھتے ہوں اور معاشرے اور ریاست میں فعال کردار ادا کر سکیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ دینی مدارس کے مقاصد تعلیم اور نصابات پر نظر ثانی کی جائے اور انہیں عصری ضرورتوں سے ہم آہنگ کیا جائے۔

ہم کہتے ہیں کہ مغربی تہذیب آج اسلام اور مسلمانوں کے لیے سب سے بڑا فتنہ اور چیلنج ہے اور علماء کرام اس فتنے کو رد نہیں کر سکتے اور اس چیلنج کا جواب نہیں دے سکتے جب تک وہ اس سے بخوبی واقف نہ ہوں لہٰذا جس طرح امام غزالیؒ نے پہلے یونانی فکر کا مطالعہ کیا اور پھر اس کا رد کیا۔ مولانا قاسم نانوتویؒ اور مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ اگر عیسائیت سے واقف نہ ہوتے تو اس کا رد کیسے کرتے؟ لہٰذا آج فوری اور سخت ضرورت اس بات کی ہے کہ دینی مدارس میں مغربی تہذیب اور اس کے تنقیدی مطالعے کا مضمون لازماً پڑھایا جائے تاکہ علماء کرام اسے سمجھ کر اس کا رد کر سکیں اور اپنے معاشرے کے مسلمانوں کو بھی مغرب کی الحادی تہذیب کے اس سیلاب سے بچا سکیں جس میں وہ بہتے چلے جا رہے ہیں اور دن بدن اسلام سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔

تعلیم و تربیت مدیر

پنجاب کے بعد

خیبر پی کے میں انگریزی ذریعہ تعلیم

اللہ ہمارے مغرب زدہ سیاستدانوں کو ہدایت دے

اخباری اطلاعات کے مطابق نئے تعلیمی سال (یعنی یکم اپریل ۲۰۱۴ء)☆ سے صوبہ خیبر پی کے کی حکومت اپنے سکولوں میں انگلش میڈیم نافذ کر رہی ہے۔اس سے پہلے پنجاب کی حکومت یہ حماقت کر کے ناکام ہو چکی ہے۔وہاں میاں شہباز شریف صاحب نے اپنے غیر ملکی (برطانوی وکینیڈین) تعلیمی مشیروں کے کہنے پر یہ حماقت کی تھی۔ یہاں یہ حماقت عمران خاں صاحب کے حکم پر کی جا رہی ہے۔کوئی ان بزرجمہروں سے پوچھے کہ:

۱- کیا اچھی انگریزی جاننے کا ذریعہ صرف انگلش میڈیم ہے؟

۲- کیا ترقی کا ذریعہ صرف انگریزی زبان ہے؟

۳- کیا اچھی انگریزی جاننے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلی جماعت بلکہ نرسری سے انگلش میڈیم کا آغاز کر دیا جائے؟

سوائے ان غلام ذہنوں کے جو مغربی تہذیب سے مرعوبیت کے سوا کوئی 'خوبی' نہیں رکھتے تمام تعلیمی ماہرین ان سوالوں کا جواب نفی میں دیتے ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ ساری دنیا کے تعلیمی ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ:

- تعلیم، خصوصاً ابتدائی تعلیم، مادری یا ملکی زبان میں دینی چاہیے۔
- ثانوی زبان اس وقت سکھانی چاہیے جب بچہ مادری یا ملکی زبان سیکھ کر اس میں مہارت حاصل کر چکا ہو۔
- مقامی ماحول اور معاشرے کے افکار و نظریات کو تعلیم کی بنیاد بنانا چاہیے۔

لیکن ہمارے حکمران اور سیاستدان (اور ان کی مشیر بیوروکریسی) بدقسمتی سے مغرب زدہ بلکہ

☆ یہ اپریل فول نہیں اپنے آپ کو اور اپنے عوام کو فول بنانے کا پروگرام ہے

مغرب پرست اور مغرب کے ذہنی غلام ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ انگریزی کے بغیر ترقی نہیں ہوسکتی (کیا چین، جاپان، جرمنی، فرانس...... نے ترقی انگریزی سیکھ کر کی ہے؟) کیا انہیں انگریزی زبان سیکھنے اور انگریزی کو ذریعۂ تعلیم بنانے میں فرق معلوم نہیں؟ کیا امریکہ، یورپ اور دنیا کے کسی ترقی یافتہ ملک میں ابتدائی تعلیم ثانوی زبان میں دی جاتی ہے؟ یہ اتنی احمقانہ حرکتیں ہیں کہ ان پر زہرخند کے سوا چارہ نہیں۔

پھر سوچیے کیا آپ نے سارے طلبہ کے لیے اور ساری جماعتوں کے لیے انگلش میڈیم میں نصابی کتب تیار کر لی ہیں؟ کیا ان کی طباعت مکمل ہوگئی ہے؟ کیا انگلش میڈیم میں پڑھانے کے لیے اتنی کثیر تعداد میں اساتذہ تیار کر لیے گئے ہیں اور ان کی ٹریننگ مکمل ہوچکی ہے؟

پھر سوال یہ بھی ہے کہ شہباز شریف ہوں یا عمران خاں، کس نے آپ کو یہ اختیار دیا ہے کہ آپ اکیلے قوم کے نظریے اور تعلیم پر شدت سے منفی طور پر اثر انداز ہونے والے اس طرح کے فیصلے خود اکیلے ہی کر لیں؟ کیا آپ نے یہ معاملہ اسمبلی میں عوام کے نمائندوں کے سامنے رکھا؟ کیا اس پر صوبے میں پبلک مباحثہ ہوا جس سے عوام کی رائے سامنے آتی؟ کیا آپ نے ماہرین تعلیم کی کوئی کانفرنس بلائی اور ان کے سامنے یہ مسئلہ رکھا؟ کیا آپ نے صوبے کی سیاسی و دینی جماعتوں سے اس موضوع پر کوئی مشاورت کی؟ یہ کس طرح کی جمہوریت ہے، جس میں ایک فرد اکیلا اپنی عقل سمجھ کے مطابق کروڑوں بچوں پر منفی طور پر اثر انداز ہونے والا فیصلہ خود اکیلا ہی کر لیتا ہے؟ کیا یہ آمریت نہیں؟

عذر یہ پیش کیا جاتا ہے کہ ہم غریبوں کے لیے بہتر مواقع پیدا کرنا چاہتے ہیں اور یکساں نظام تعلیم نافذ کرنا چاہتے ہیں؟ ہم کہتے ہیں کہ یہ عذر لنگ ہے۔ کیا یکساں تعلیم کا مطلب یہ ہے کہ قوم کو باطل پر جمع کر دیا جائے؟ کیا یکسانیت یہ ہے کہ قوم کو مغرب کا فکری غلام بنا دیا جائے اور تعلیم کے مغربی تصورات پر ساری قوم کو اکٹھا کر دیا جائے؟ اسلام، اردو، نظریۂ پاکستان اور مقامی ماحول اور ضروریات کو نظر انداز کر کے قوم کو کالا انگریز بنانے کی کوشش میں عقل مندی کا آخری کون سا پہلو ہے؟ ہم اپنے سیاستدانوں اور حکمرانوں سے کہتے ہیں کہ وہ خدا کا خوف کریں اور اس قوم کے بچوں کو یکسو اور باعمل مسلمان اور پاکستانی بنائیں۔

تزکیۂ نفس　　　　　　　　　　　　　　احمد جاوید

لہو ولعب سے کیسے بچا جائے؟

لہو ولعب کی تعریف

فضولیات میں مشغولیت لہو ولعب ہے اور یہ سب آدمی تفریح کی غرض سے کرتا ہے، حالانکہ نہ اس کا کوئی دینی فائدہ ہے اور نہ دنیاوی بلکہ اس کے برعکس نقصان یقیناً ہے۔ یہ خیال رہے کہ کھیل کود، ہنسی مذاق وغیرہ مسلمان کی زندگی میں وہ رنگ بھرتے ہیں جو اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کو پسند ہیں لیکن لہو ولعب کا معاملہ دوسرا ہے اور اس میں جھوٹ سچ، جائز ناجائز ملا ہوا ہے اور اس میں مشغولیت کم از کم اس پہلو سے قطعاً ناروا ہے کہ یہ انسان کو دینی فرائض سے غافل کر دیتی ہے حسب قولہ تعالیٰ "وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا انْفَضُّوْٓا اِلَيْهَا وَتَرَكُوْكَ قَآئِمًا قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ وَاللّٰهُ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ (الجمعة:۱۱) یعنی اے نبی! بعض لوگ جب کوئی تجارت یا کھیل تماشے دیکھتے ہیں تو اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں اور آپ کو خطبہ پڑھتے کھڑا چھوڑ دیتے ہیں۔ آپ ان سے کہیں کہ "جو اللہ کے پاس ہے وہ کھیل تماشے اور تجارت سے بہتر ہے اور اللہ بہترین رزق دینے والا ہے۔

لہو ولعب اور تفریح میں فرق

تفریح آدمی کی طبیعت میں فرحت، ذہن میں نشاط اور جسم میں قوت پیدا کرتی ہے۔ یہ تینوں چیزیں مطلوب ہیں۔ دوسرے یہ کہ تفریح اس نفسیاتی خشکی کا بھی علاج ہے جو تکبر، خودغرضی اور مریضانہ ذہنیت کا سبب بنتی ہے۔ یہ تفریح جس کے خصائص ابھی بیان ہوئے، صرف دو شرائط سے مشروط ہونی چاہیے۔ شریعت کے کسی امر کی خلاف ورزی نہ ہو اور اس میں ایسا انہماک نہ ہو جو بعض بہتر مشغولیات سے غافل کر دے۔ ان دو چیزوں کا خیال رکھتے ہوئے یہ بات شرعاً مستحب ہے کہ مسلمان اپنے نفس اور اپنے بدن کے حقوق پورے کرے یعنی انہیں راحت وقوت فراہم کرے تاکہ زندگی کے تمام معاملات میں اس کا دینی کردار بھی تقویت پائے۔ صحت اور فرصت اللہ کی بہت بڑی نعمتیں ہیں جن سے محرومی بعض فضائل سے محرومی بن جاتی ہے۔ لہٰذا نہیں حاصل کرنے اور محفوظ رکھنے کی ہر کوشش پسندیدہ ہے۔ لہو ولعب کا یہ معاملہ ہے کہ عموماً اس کی صورت تو تفریح کی ہوتی ہے لیکن اس میں مذکورہ بالا دونوں شرائط کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ مثال کے طور پر لہو ولعب کی عادت کئی شرعی احکام کی خلاف ورزی پر منتج ہوتی ہے اور وقت کا ضیاع اس کا لازمہ ہے۔

تفریح اور لہو ولعب میں فرق واضح کرنے کے لیے مناسب محسوس ہوتا ہے کہ ان کے مظاہر الگ الگ بیان کر دئے جائیں:

تفریح کے مظاہر

۱۔ ہرطرح کی جسمانی ورزش جس میں آداب ستر ملحوظ رکھے جائیں۔ ۲۔ لمبی سیر ۳۔ تیراکی ۴۔ مناظر فطرت کا مشاہدہ، خواہ اس کے لیے سفر ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ ۵۔ عزیزوں دوستوں کے درمیان ایسا ہنسی مذاق جو کسی کی دلآزاری کا سبب نہ بنے اور اس میں غیبت، فحش گوئی، جھوٹ وغیرہ کی آمیزش نہ ہو۔ ۶۔ ایسی کتابوں کا مطالعہ جو طبیعت پر خوشگوار اثر مرتب کرے۔ اس میں بھی وہی احتیاطیں ہیں جو ہنسی مذاق کے معاملے میں بتائی گئی ہیں۔ البتہ جھوٹ کی آمیزش کی شرط یہاں ساکت ہے کیونکہ اس طرح کا لٹریچر فرضی صورتحال پر مشتمل ہوتا ہے لہٰذا قاری اس کے مندرجات پر یقین کرنے کی نیت سے ان کا مطالعہ نہیں کرتا۔ تاہم یہ ذہن میں رہے بعض تفریحات جائز ہونے کے باوجود کسی مصلحت اور ثقاہت کے منافی ہوسکتی ہیں۔

لہو ولعب کے مظاہر

وہ تمام کھیل جو غافل اور بے عمل لوگوں کا شعار بن گئے ہیں۔ یہ ملحوظ رہے کہ تفریح اور لہو ولعب میں طبیعت کی فرحت مشترک ہے لیکن ذرائع اور نتائج مختلف ہیں۔ تفریح کے ذرائع جائز اور نتائج مطلوب ہیں جبکہ لہو ولعب کی ایک خطرناک قسم وہ ہے جو دینی رنگ میں اپنا اظہار کرتی ہے مثلاً عید میلاد النبی، بزرگوں کے عرس منانا، قوالیاں، دھمال، اکثر مناظرے اور جاہل عالموں کے وعظ، بزرگوں کے جھوٹے تذکرے سننا سنانا، پراسرار باتوں میں دلچسپی وغیرہ۔ غرض اس طرح کے لہو ولعب کو پہچاننے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ آدمی سنت وبدعت کے فرق کا علم حاصل کرے۔ دینی زندگی میں بدعت ہی لہو ولعب کی ماں ہے۔

لہو ولعب کے نقصانات

لہو ولعب کا سب سے بڑا نقصان تو یہی ہے کہ آدمی دینی مزاج سے محروم ہو جاتا ہے۔ باقی نقصانات کی کچھ تفصیل حسب ذیل ہے: ۱۔ غفلت ۲۔ اسراف ۳۔ لوگوں کو ایذا پہنچانا ۴۔ وقت کا ضیاع ۵۔ جھوٹ، غیبت، بہتان، فحش گوئی، نفس پرستی وغیرہ کا میلان۔ ۶۔ دین کے دو بنیادی فضائل یعنی خشیت الٰہی اور اتباع رسول ﷺ کا فقدان۔ ۷۔ دنیا کی بربادی ۸۔ لہو ولعب کا اس سے بڑا نقصان کیا ہوسکتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے فرمان کے مطابق اس سے آدمی کی آخرت برباد ہوسکتی ہے اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہوسکتا ہے۔

علاج

اس کے علاج کا اصول کوئی مثبت اور بامقصد مصروفیت ہے۔ وہ اختیار کرلی جائے تو ان شاء اللہ اس سے نجات مل جائے گی مثلاً تعلیم وتعلم، کوئی فن سیکھنا سکھانا اور کوئی تفریحی سرگرمی وغیرہ۔

میڈیا نغمہ حبیب

میڈیا میں ریٹنگ کی دوڑ

اسلامی واخلاقی اقدار کی تباہی کا سبب

الیکٹرانک میڈیا حکمرانوں کی باگ اپنے ہاتھ میں پکڑے،عوام کو قابو میں کیے ہوئے،عدالتوں پر اثر اندازی کا اصول اپنائے ہوئے،معاشرتی اور ثقافتی اقدار کی دھجیاں بکھیرتے ہوئے ایک بے قابو جن بنتا جار ہاہے۔ہر چینل دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش میں ہر پابندی سے آزاد ہوتا جار ہاہے۔نہ اخلاقیات،نہ مذہب،کچھ بھی اہم نہیں رہا ہے۔سیاست پہ بات کم لڑائی اور توہین زیادہ کروائی جاتی ہے۔جس پروگرام میں ایک دوسرے کی زیادہ سبکی اور بے عزتی کی جائے وہ بار بار دکھا کر اپنی ریٹنگ بڑھائی جاتی ہے اور عوام کو جس چسکے کا عادی بنا دیا گیا ہے وہ انہیں اکثر اوقات فراہم کیا جاتا ہے۔نجی چینلز کے ابتدائی زمانے کی بات ہے شاید قارئین کو بھی یاد ہوگا کہ ایک لڑکی دکھائی گئی اور کہا گیا کہ لباس سے آزاد یہ لڑکی اٹھارہ سال تک جنگل میں رہی یعنی ہمارے ایک چینل نے اسے دریافت کیا اور شیرخوارگی میں گم ہونے والی اس بچی کو اس کے ماں باپ نے شناخت بھی کر لیا،کیسے؟ یہ ایک معمہ ہی ہے۔ایسی دریافتیں اب بھی اس چینل کی طرف سے جاری ہیں اور دیگر بھی اس دوڑ میں پیچھے ہی سہی دوڑے جا رہے ہیں۔میڈیا کے تعاون سے بچے برائے فروخت کا ایک دور چلا،خودکشی کرنے والوں کو ہیرو ہیروئن بنا کر پیش کرنے کا فیشن بھی میڈیا میں ''اِن'' رہا۔اُن غریبوں کی غربت کا رونا رویا گیا جن کے گھر واشنگ مشین،ٹی وی،فریج اور موبائل موجود تھے۔ایسا ہی ایک کیس لاہور کی صائمہ کا تھا اور پھر سلسلہ چلتا گیا۔اخلاقی اقدار پر جو حملہ خود ہمارا اپنا میڈیا کر رہا ہے اُس کا رونا روتے روتے تو شریف خاندانوں کی آوازیں بیٹھ گئی ہیں لیکن اس حملے کی شدت میں کمی کی بجائے روز بہ روز اضافہ ہی ہو رہا ہے۔پڑوسی ملک سے محبت کا ثبوت دیتے اور امن کی آشا کی پتنگ اڑاتے اڑاتے اپنی اقدار کا جنازہ نکال دیا گیا ہے۔کم لباسی بھی کوئی عیب نہ رہا اور مرد وعورت کا آزادانہ میل جول بھی بلکہ اب تو پروگرام میں بلائے گئے مہمان گلے مل کر ملتے ہیں اور اس میں صنف کی کوئی تمیز نہیں چاہے مرد ہو یا عورت۔مارننگ شوز ہماری اسی نئی ثقافت اور معاشرت کی مثالیں ہیں۔مذہب کو تو ہم کب کا بھول چکے ہیں کیونکہ مذہب کو سوچا تو ریٹنگ کیسے بڑھے گی؟ مذہب میں تو رکھ رکھاؤ ہے،انسانیت کی اعلیٰ اقدار ہیں اور معاشرے کی تباہی کے لیے پہلے ان کی تباہی ضروری ہے۔

اب ذرا سیاسی،معاملات کی طرف آیئے جو نیوز چینلز کے لیے خوراک کا درجہ رکھتے ہیں اور ہر روز

رات کو بڑی باقاعدگی سے حالات حاضرہ کے نام پر یہ سیاسی لڑائیاں دکھائی جاتی ہیں جن میں اینکرز خواتین وحضرات مکمل کوشش کر کے شرکاء کولڑوا دیتے ہیں۔فردوس عاشق اعوان اور کشمالہ طارق کی لڑائی ایسی ہی ایک ابتدائی مثال تھی جس کے بعد کئی مثالیں قائم ہوئیں اور ہورہی ہیں یعنی جتنا زیادہ گڑ ڈالا جاتا ہے اتنی ہی مٹھاس آتی ہے اور ریٹنگ اتنی ہی بڑھتی جاتی ہے۔کچھ ایسے پروگرام بھی پیش کیے جاتے ہیں جیسے پانی سے چلنے والی گاڑی، ایک عام پاکستانی بھی کچھ دن خوش ہو جاتا ہے کہ اب لانگ ڈرائیو پر نکلنا اس کے لیے بھی ممکن ہوگا اور چینل کی ریٹنگ خود بہ خود آسمان کو چھو جاتی ہے۔ ریٹنگ کی اس دوڑ نے ہمارے میڈیا کو صحافت کے مروجہ اصولوں اور اخلاقیات سے آزاد کر دیا ہے، معیار کی جگہ رنگینی اور چسکے نے لے لی ہے اور ایسا ریٹنگ کی دوڑ کی وجہ سے ہے جس کے لیے ہر اخلاقی وغیر اخلاقی طریقہ آزمایا جارہا ہے۔ ریٹنگ کے لیے جو طریقہ کار استعمال کیا جارہا ہے وہ ہرگز کسی چینل کی مقبولیت کا معیار نہیں سمجھا جا سکتا۔اس طریقے کے تحت صرف چند شہروں میں چند گھروں پر کچھ میٹر لگائے گئے ہیں جن سے دیکھے جانے والے چینلز کو مانیٹر کیا جاتا ہے اور رپورٹس کے مطابق ریٹنگ بڑھانے کے لیے ان میٹرز کو خود بھی آگے پیچھے کر دیا جاتا ہے اور یوں اپنی ریٹنگ بڑھا کر مزید اشتہارات حاصل کر لیے جاتے ہیں یعنی مالکان کی تجوریاں بھرتی جاتی ہیں اور ان اینکرز کے بینک بھی۔اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ چند ایک بڑے شہر مثلاً اسلام آباد، راولپنڈی، لاہور، کراچی وغیرہ اور اُن میں بھی چند گھر پورے پاکستان یا پوری دنیا کی نمائندگی کے حق دار کیسے ہو گئے؟ پیمرا کو بھی کچھ سوچنا چاہیے اور کسی چینل یا پروگرام کو نمبر ایک قرار دینے سے پہلے اس کے بارے میں عوام کی رائے بھی جان لینا چاہیے اور قومی سلامتی کے تقاضوں سے ہم آہنگی اور قومی سلامتی، قومی نظریے، قومی اداروں اور بین الاقوامی طور پر قومی عزت کے تحفظ کو بھی مدنظر رکھنا چاہیے کیونکہ قومی سلامتی کو باقی تمام چیزوں پر مقدم ہونا چاہیے۔ ریٹنگ کی دوڑ نے ہمارے میڈیا کو تمام تر اخلاقی وقومی تقاضوں سے آزاد کر دیا ہے اور ہر چینل اسی کے پیچھے دوڑ رہا ہے چاہے اس کے لیے کچھ بھی کرنا پڑے۔حکومت اور اداروں کی کرپشن اور خرابیاں اجاگر کرتا ہوا میڈیا اگر اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھے تو اسے وہاں بھی بہت سے جرائم نظر آئیں گے لیکن ان کو دکھانے کے لیے کوئی ''شیڈو میڈیا'' نہیں ہے کہ عوام اس کے بارے میں جان سکیں۔

میڈیا کو معاشرے میں اچھی روایات کی بنیاد ڈالنے کے لیے کردار ادا کرنا چاہیے۔اسے قومی اتحاد کا پیامبر ہونا چاہیے، خرابیوں کی نشاندہی کرنا چاہیے نہ کہ انہیں اچھال اچھال کر سیاسی جنگوں اور بین الاقوامی سبکی کا باعث بنایا جائے۔اسی میں ہماری بقا اور عزت ہے اور میڈیا کے لیے بھی عوام الناس میں احترام کا ایک ایسا جذبہ پیدا ہوگا جو خود بہ خود اس کی ریٹنگ بڑھا دے گا، بغیر کسی ناجائز ذریعہ کے استعمال کے۔

اسلام اور سائنس

ڈاکٹر محمد شہباز منج ☆

مذہب اور سائنس ۔ باہمی تعلق کی صحیح نوعیت

جدید سائنس کے حیرت زا اکتشافات نے بعض لوگوں کو اس درجہ مسحور کیا کہ وہ اسے مذہب کی شکست سے تعبیر کرنے لگے۔ یورپ میں یہ خام خیال خاصہ عام ہوا اور بڑے بڑے مفکرین اس کے موید بن گئے۔ مشہور ماہر نفسیات سگمنڈ فرائڈ نے یہاں تک کہہ دیا کہ انسانی زندگی تین نفسیاتی ادوار سے گزرتی ہے: دورِ وحشت، دورِ مذہب اور دورِ سائنس۔ سائنس آ چکی لہذا مذہب قصۂ پارینہ ہوا۔ ہر چند کہ ہر کوئی اس انتہا تک نہ گیا ہو لیکن یہ بات مغرب میں قریب قریب طے ہوگئی کہ مذہب اور سائنس دو الگ الگ چیزیں ہیں جن کا آپس میں کوئی علاقہ نہیں۔ مذہب کی باتیں سائنس سے متصادم ہوتی اور سائنسی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہیں، لہٰذا سائنسی ترقی کے لیے مذہبی اعتقادات سے کنارہ کشی امر لازم ہے۔ سائنس کے کرشموں کی بدولت سیکولر ذہنیت کے لوگ تو مذہب سے بدظن اور اس کے خلاف تعصب کا شکار ہوئے ہی، بہت سے مذہب پسند لوگ بھی اس کے سحر میں یوں آئے کہ مذہب کی قطع وبرید کر کے اسے سائنس کے مطابق ڈھالنے پر اتر آئے۔ اس رویہ نے اہل اسلام میں کافی فروغ حاصل کیا۔ اگر چہ شاذ ہے، لیکن بعض مذہب پسند اہل اسلام میں ایک رویہ یہ بھی ہے کہ سائنس فی نفسہ ایک برائی ہے۔ یہ کائنات سے متعلق اپنا خاص زاویۂ نظر رکھتی ہے، خدا اور مذہب کی دشمن ہے اور بنی نوع انسان کو بے جا طور پر مادیات میں الجھا کر اخلاقی و روحانی نقصان وخسران اور ضلالت وگمراہی میں مبتلا کرنے کا سبب بنتی ہے۔ ذیل کی گزارشات میں یہ جائزہ لینا مقصود ہے کہ کیا واقعی مذہب اور سائنس میں تصادم ہے؟ اگر یہ بات درست نہیں تو مذہب اور سائنس میں تصادم کا تصور کیونکر پیدا ہوا؟ کیا اسلام اور سائنس میں بھی تصادم ہے؟ قرآن اور سائنس کے باہمی تعلق کی صحیح نوعیت کیا ہے؟ نیز قرآن اور سائنس کے متعلق مسلمانوں کا رویہ کیسا ہونا چاہیے؟

مذہب اور سائنس میں اختلاف کا تصور کب اور کیونکر پیدا ہوا؟

حضرت مسیح علیہ السلام کی ولادت سے تقریباً چار سو سال قبل یونان نے علم وحکمت میں خوب ترقی کی۔ اس سر زمین میں افلاطون اور ارسطو جیسی نابغۂ روزگار شخصیتوں نے جنم لیا۔ یہاں غور وفکر اور تحقیق و تفحص پر کوئی پابندی نہ تھی۔ چنانچہ یونانی حکماء نے کائنات سے متعلق مختلف اور متعدد نظریات پیش کیے۔

☆ شعبہ اسلامیات، یونیورسٹی آف سرگودھا، سرگودھا

یہ لوگ اگر چہ اپنے فکر کو تجربی طریق سے ثابت کرنے کے عادی نہ تھے، تاہم انہوں نے آزادانہ غور وفکر سے کافی علمی مواد بہم پہنچایا۔ جب قدیم یونانی سلطنت زوال پذیر ہوئی اور اہل روم اور اہل کارتھیا کی طویل آویزش رومیوں کی فتح پر منتج ہوئی، تو سلطنت کے طول وعرض میں عیسائیت کے فروغ کے لیے راہ ہموار ہوگئی۔ مسیحی تحریک نے رفتہ رفتہ ایشیائے کوچک، قبرص، یونان، اٹلی، فرانس اور برطانیہ وغیرہ ممالک پر بھی اپنا تسلط جما لیا۔ مسیحیوں نے مسیح کی تعلیمات کا حلیہ بگاڑ دیا۔ انہوں نے اپنی دنیاوی اغراض کی خاطر الہامی تعلیمات میں اپنی پسند و ناپسند کے مطابق ترمیم واضافہ اور تحریف وتبدیلی کر لی۔ عیسائیت سازی کے دوران اہل کلیسا نے جہاں اللہ کی کتاب کو اپنے مفادات کے تابع کیا، وہاں یونانیوں کے بہت سے بے سروپا تخیلات کو مذہبی تقدس کا رنگ دے کر اناجیل کا حصہ بنا دیا۔ صرف اسی پر بس نہیں بلکہ ان باتوں کو مسلمہ الہامی تعلیمات کے طور پر اپنے زیر اثر ممالک میں پھیلایا گیا۔ کسی فرد کو اجازت نہ تھی کہ وہ ان تعلیمات پر بحث کرے اور ان کے خلاف زبان کھولے۔ وہ لوگ جو آزادانہ غور وفکر سے اپنے نظریات پیش کرتے یا ایسی کتابیں شائع کرتے جن میں مندرج باتیں انجیل مقدس کی تعلیمات سے متصادم ہوتیں، ان کو سخت سزائیں دی جاتیں اور کتابیں ناجائز قرار دے کر ضبط کر لی جاتیں یا ان کو جلا دیا جاتا۔ جرمن سائنسدان کپلر کو ''خلاصہ نظام کوپرنیکس'' شائع کرنے کی پاداش میں کافر قرار دیا گیا اور اس کی کتاب ضبط کر لی گئی۔ اٹلی کے مشہور فلسفی برونو کو، جو تعدد عوالم کا قائل تھا، زندہ جلا دیا گیا۔ گلیلیو نے نظام کوپرنیکس کی تائید میں ''نظام عالم'' شائع کی تو پابند سلاسل کر دیا گیا۔ دس سال تک انتہائی الم اُٹھانے کے بعد جب 1642ء میں اس کا انتقال ہوا تو مسیحی قبرستان مین دفن نہیں ہونے دیا گیا۔

اہل کلیسا کے مظالم کے باوصف اہل سائنس نے اپنا کام جاری رکھا۔ بالآخر مسیحیت نے سائنسدانوں کے بے پناہ عزم وثبات کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے۔ سائنس پورے طمطراق کے ساتھ میدان میں اُتری اور مذہب کو علم وسائنس کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ تصور کرتے ہوئے مسترد کر دیا گیا۔

اختلاف سائنس ومسیحیت مذہب بیزاری پر منتج ہوا

سائنسدانوں پر اہل کلیسا کے مظالم کی وجہ سے یورپ کے علمی حلقوں میں عیسائیت کے خلاف شدید ردعمل پیدا ہوا۔ عیسائی مذہب چونکہ بہت سی بے سروپا روایات اور غیر سائنسی تعلیمات کو ماننے پر مجبور کرتا تھا، مشاہدہ، تجربہ اور آزادانہ غور وفکر پر قدغن لگاتا تھا، جبکہ سائنس کا دارومدار ہی غور وفکر اور مشاہدہ ومطالعہ فطرت پر ہے، چنانچہ پڑھے لکھے لوگ مذہب سے بیزار ہو گئے۔ اگر چہ یہ بیزاری اصولاً مذہب کے خلاف نہیں بلکہ عیسائیت کے خلاف ہونا چاہیے تھی، جو اپنی خامیوں اور نقائص کی بنا پر اس کی ذمہ دار تھی، مگر چونکہ

یورپ میں عیسائیت ہی مذہب کی نمائندہ تھی، لہٰذا مسیحیت سے بیزاری مذہب اور خدا سے بیزاری پر منتج ہوئی۔

اسلام اور سائنس میں کوئی تصادم نہیں:

سائنس اور عیسائیت کے تضاد و تصادم اور عیسائیت کے نقائص آشکارا ہو جانے کے بعد سائنسدان مذہب و خدا سے کنارہ کش ہو کر مادی نظریات سے وابستہ ہو گئے۔ ان میں سے اکثر مذہبی مسائل سے محض لاتعلقی اور نفرت کا جذبہ رکھتے ہیں، اور مذہب کو اوہام و خرافات پر مبنی قرار دیتے ہیں۔ مغرب میں مذہب و سائنس پر گفتگو کرتے ہوئے یہودیت و عیسائیت کے ذکر پر قناعت کی جاتی ہے اور اسلام کے بارے میں مشکل ہی سے سوچا جاتا ہے۔ گویا ان کے نزدیک اسلام بدرجہ اولی اوہام و خرافات پر مبنی، غیر صحیح اور سائنس سے متصادم ہے۔ موریس بکائی لکھتے ہیں:

"The majorities of today scientists with a small number of exceptions of course, are indeed bound up in materialist theories and have only indifference or contempt for religious questions which they often consider to be founded on legend. In the west moreover when science and religion are discussed, people are quite willing to mention Judaism and Christianity among the religions referred to, but they hardly ever think of Islam. So many false judgments based on inaccurate ideas have indeed been made about it, that today it is very difficult to form an exact notion of the reality of Islam." (1)

اس کے باوجود کہ دین اسلام عیسائیت کے تمام نقائص سے پاک تھا، بہت سے مسلمان مغرب کی کورانہ تقلید میں مذہب کے خلاف علمی تعصب کا شکار ہو کر مذہب اور خدا کے عقیدے کو سائنس سے الگ رکھنے پر مصر نظر آنے لگے اور اپنے دین مبین کی عظمت کو فراموش کر بیٹھے ؂

اے بعشق دیگراں دل باختہ
آبروئے خویش را نشناختہ

اکثر مغربی سائنسدانوں اور ان کے اندھے مسلم مقلدین کے تصورات کے برعکس اسلام کا سائنس یا دیگر تجربی علوم سے کوئی تصادم نہیں بلکہ قرآن حکیم میں حق تعالیٰ نے ارباب دانش کو اپنی تخلیق میں غور و فکر کی تاکید کی ہے، جس سے سائنسی علوم کے حصول کی ترغیب ملتی ہے۔ قرآن کے نقطہ نظر سے کائنات میں تفکر و تدبر اور اس کے اسرار و رموز سے واقفیت ایمان و یقین میں پختگی کا باعث ہے۔ مولانا مودودی

لکھتے ہیں:

یہ کہنا کہ سائنس تو ایک عالمگیر چیز ہے اس کا کسی مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ فی الواقع بڑی نافہمی کی بات ہے ... حقیقت یہ ہے کہ سائنس کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جو انسانوں کے دل میں ایمان کو گہری جڑوں سے رائج کرنے والا نہ ہو۔ فزکس، کیمسٹری، بیالوجی۔ اناٹومی، اسٹرانومی غرض جس علم کو بھی دیکھیں اس میں ایسے حقائق سامنے آتے ہیں جو انسان کو پکا اور سچا مومن بنا دینے کے لیے کافی ہیں۔ سائنس کے حقائق سے بڑھ کر آدمی کے دل میں ایمان پیدا کرنے والی کوئی دوسری چیز نہیں ہے۔ یہی تو وہ آیات الٰہی ہیں جن کی طرف قرآن بار بار توجہ دلاتا ہے مگر صرف اس وجہ سے کہ کافر سائنسدانوں نے ان حقائق کو اپنے نقطۂ نظر سے مرتب اور بیان کیا ہے، انہیں پڑھ کر آدمی الٹا مادہ پرست اور ملحد بنتا ہے اور خدا کے تصور پر ہنستا اور مذاق اُڑاتا ہے۔(2)

اسلام اور سائنس کے قریبی تعلق، جدید سائنس کے نقطہ نگاہ سے قرآن کی عظمت اور سائنسی معلومات سے اس کے بہتر فہم کا ذکر کرتے ہوئے مورلیس بکائی لکھتے ہیں:

" It comes as no surprise, Therefore, to learn that religion and science have always been considered to be twin sisters by Islam and that today, at a time when science has takes such great strides, they still continue to be associated. And further more certain scientific data used for the better understanding of the Quranic text." (3)

دور جدید کے کئی مغربی مفکرین بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ سائنس اور مذہب باہم متضاد نہیں بلکہ دونوں کا آپس میں گہرا ربط ہے۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ سائنس کو خدا کے عقیدہ اور اس عقیدہ کے تحت اخلاقی قدروں کے ساتھ مربوط ہونا چاہیے۔ یہ قرآن حکیم کی طرف ایک غیر شعوری جھکاؤ ہے۔ یہاں اس سلسلہ میں ڈاکٹر رفیع الدین کے سیارہ ڈائجسٹ میں شامل مقالہ کے حوالے سے دو مفکرین کی آراء کی نقل جاتی ہیں: پروفیسر سوادکن، ہارورڈ یونیورسٹی کے شعبہ عمرانیات کا سابق صدر، لکھتا ہے: ''مذہب اور سائنس کا موجودہ تضاد خطرناک ہی نہیں بلکہ غیر ضروری بھی ہے۔ اگر خدا اور اخلاقی اقدار کا صحیح تصور میسر آ جائے تو اس کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جائے گی کہ مذہب اور سائنس دونوں ایک ہیں اور ایک ہی مقصد کی پیش برد کے لیے اپنا وجود رکھتے ہیں۔ یعنی یہ کہ تجربات کی اس قریبی دنیا میں

خدائے مطلق کی قدرتوں کو بے نقاب کیا جائے تا کہ انسان کی شرافت اور خدا کی عظمت دونوں کا اثبات عمل میں آئے۔'' فیلڈ مارشل سمٹس، فلسفہ کی بلند پایہ کتاب ہولزم *Holism* کا مصنف، لکھتا ہے:
''صداقت کی مخلصانہ جستجو اور نظم اور حسن کے ذوق کے اعتبار سے سائنس مذہب اور فن کے اوصاف سے حصہ لیتی ہے... اصل بات یہ ہے کہ یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ شائد سائنس ہمارے اس عہد کے لیے خدا کی ہستی کی واضح ترین نقاب کشائی ہے... سچی بات تو یہ ہے کہ نوع انسانی کو جو کارہائے نمایاں سرانجام دینے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہوگا کہ وہ سائنس کو اخلاقی قدروں کے ساتھ ملحق کرے گی اور اس طرح سے اس بڑے خطرے کا ازالہ کرے گی جو ہمارے مستقبل کو درپیش ہے۔'' (4) علامہ اقبال کے نزدیک مذہب اور سائنس دونوں کا مقصد سچائی اور حقیقت کی تلاش ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"The truth is that the religious and scientific processes, though involving different methods, are identical in their final aim at reaching the most real." (5)

قرآن اور سائنس کا باہمی تعلق

بعض مسلم اہل فکر ہر طرح کے سائنسی نظریات کی قرآن سے مطابقت ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ رویہ ظاہر ہے کہ غیر علمی اور سائنسی اکتشافات سے بے جا مرعوبیت کی دلیل ہے۔ قرآن بنیادی طور پر سائنس کی کتاب ہے اور نہ سائنسی اُصولوں کو بیان کرنا اس کا مقصود۔ یہ بنی نوع انسان کے لیے الہامی صحیفۂ ہدایت ہے۔ تاہم بعض دیگر مسلم اصحاب قلم کا یہ خیال بھی انتہائی سطحی ہے کہ قرآن اور سائنس میں قطعاً مغائرت ہے۔ سائنس اگر طبیعی کائنات کے غیر جانبدارانہ مشاہدہ اور اس سے متعلق بنیادی حقائق کا مطالعہ ہے، (6) اگر اس کے معنی جاننے اور سیکھنے کے ہیں، (7) اگر اس کا مطلب علم ہے، (8) اگر یہ مشاہدے سے دریافت ہونے والے نتائج یا علمی حقائق کو مرتب اور منظم کرنے کا نام ہے، (9) اگر یہ تجرباتی علوم وحکمت یا فطری وطبیعی مظہر کا باقاعدہ علم یا ایسی سچائی ہے، جو مشاہدہ، تجربہ یا استقرائی منطق سے معلوم کی گئی ہو، یا طبیعی حقائق کا وہ علم ہے، جو مشاہدے اور تجربے سے حاصل ہو، (10) اگر اس کے معنی غیر جانبداری سے حقیقت کے کسی پہلو کا باقاعدہ مطالعہ کرنے کے ہیں، (11) تو قرآن اور سائنس میں مغائرت کا دعویٰ کیسے درست ہوسکتا ہے؟ جبکہ قرآن خود جگہ جگہ علم، مشاہدہ، تدبر وتفکر اور حقائق کا شعور وادراک حاصل کرنے پر زور دیتا ہے۔ بلاشبہ قرآن کا اصل اور بنیادی کام انسان کی ہدایت ہے۔ تاہم وہ جہاں انسان کو اللہ کی معرفت کا درس دیتا ہے، وہاں اللہ کی کبریائی، خلاقیت اور علم وقدرت وغیرہ کے اظہار کے لیے اور اپنے دعوؤں کی حقانیت کے ثبوت میں کائنات اور اس میں کارفرما قوانین طبیعی سے تعرض

کرتے ہوئے ان کے کسی نہ کسی پہلو کو بطور دلیل پیش کرتا ہے، اور ساتھ ہی ساتھ کائنات اور اس کے مظاہر کے مشاہدہ اور مطالعہ پر زور دیتا ہے۔ یوں قرآن سائنس کی کتاب نہ ہوتے ہوئے بھی سائنسی مواد کو زیر بحث لاتا ہے۔ ذیل میں اس سلسلہ میں تحصیل علم اور مشاہدہ و تجربہ اور تدبر فی الخلق کے حوالے چند آیات سے مختصراً استشہاد کیا جاتا ہے۔

تحصیل علم

سائنس کی تعریف میں ہم نے دیکھا کہ اس کا مطلب علم و دانش ہے، اور اس کی بنیاد کسی شئے کے شعور و ادراک پر ہے۔ قرآن بھی حصول علم پر بے حد زور دیتا ہے۔ چند آیات ملاحظہ ہوں: اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ o خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ o اِقْرَاْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ o الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ o عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ o (12) یہ آیات قرآن کی سب سے پہلے نازل ہونے والی آیات ہیں۔ یوں قرآن نے سب سے پہلے علم و تعلم کی اہمیت واضح کی۔ سورۂ رحمٰن میں رحمٰن کا تعارف کراتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا: اَلرَّحْمٰنُ o عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ o خَلَقَ الْاِنْسَانَ o عَلَّمَهُ الْبَیَانَ o (13) نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد تعلیم دینا تھا: هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ o (14) قرآن کے نزدیک علم والے اور جاہل کبھی برابر نہیں ہو سکتے: قُلْ هَلْ یَسْتَوِی الَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ وَالَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ اِنَّمَا یَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ o (15) علم والے اللہ کے ہاں صاحبان فضل و کمال ہیں: یَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ o (16) قرآن حصول علم پر اس لیے بھی زور دیتا ہے کہ اہل علم ہی اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں: اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا o (17) علم والے ہی اللہ کی دی ہوئی مثالوں کو سمجھتے ہیں: وَ تِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَ مَا یَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ (18) انسان کو اس کی تخلیق کے بعد سب سے پہلے علم الاشیاء دیا گیا اور اسی بنا پر اسے فرشتوں پر فضیلت بخشی گئی: وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَ یَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ o وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَی الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِئُوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ o قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ o قَالَ یٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ

وَ اَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَ مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ o (19) علم کی انتہائی اہمیت کے پیش نظر علم میں اضافے کی دعا تعلیم فرمائی گئی: وَ قُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا o 20) چنانچہ حصولِ علم کے اعتبار سے قرآن اور سائنس میں ایک واضح ربط دکھائی دیتا ہے۔

مشاہدہ، تجربہ اور تدبر فی الخلق

سائنس میں مشاہدہ کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ قرآن حکیم میں بھی متعدد مقامات پر تدبر و تفکر اور مشاہدۂ کائنات کی دعوت دی گئی ہے۔ چند آیات ملاحظہ ہوں: ''بے شک آسمانوں اور زمین کی تخلیق اور رات اور دن کے اختلاف اور ان کشتیوں میں جو سمندر میں چلتی ہیں لوگوں کے نفع کی چیزوں کے ساتھ۔ اور آسمان سے پانی نازل کرنے، پھر اس کے ذریعے زمین کے مردہ ہو جانے کے بعد اس کو زندہ کرنے اور اُس میں ہر طرح کے جاندار پھیلانے اور ہواؤں کے چلنے اور بادلوں کے آسمان و زمین کے درمیان مسخر ہونے میں اہل عقل کے لیے نشانیاں ہیں۔'' (21) ایک جگہ فرمایا گیا کہ زمین میں اہل ایمان کے لیے اللہ کی توحید و قدرت کی نشانیاں ہیں اور تمہاری اپنی ذات میں بھی تمہارے لیے اللہ کی ہستی اور اس کی خالقیت اور ربوبیت کی علامات ہیں، تم کیوں بصیرت سے کام نہیں لیتے: وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ o وَفِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ o (22) قرآنِ حکیم جہاں مومنین سے ذکر خداوندی کی توقع رکھتا ہے، وہاں وہ اس بات کی بھی توقع رکھتا ہے کہ وہ کائنات کی تخلیق پر غور و فکر کریں: اَلَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَ یَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ o (23) قرآن کا فرمان ہے کہ زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح مخلوق کو اوّل اوّل پیدا کیا: قُلْ سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَیْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللّٰهُ یُنْشِئُ النَّشْاَةَ الْاٰخِرَةَ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ o (24) جانوروں، زمین و آسمان اور پہاڑوں کی ساخت میں اللہ تعالیٰ کی نشانیاں ہیں۔ لہٰذا انسانوں کو ترغیب دی گئی ہے کہ وہ اس سلسلہ میں مشاہدہ اور تفکر و تدبر سے کام لیں: اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ كَیْفَ خُلِقَتْ o وَاِلَی السَّمَآءِ كَیْفَ رُفِعَتْ o وَاِلَی الْجِبَالِ كَیْفَ نُصِبَتْ o وَاِلَی الْاَرْضِ كَیْفَ سُطِحَتْ o (25) اَفَلَمْ یَنْظُرُوْٓا اِلَی السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَیْفَ بَنَیْنٰهَا وَزَیَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ o (26) اَوَ لَمْ یَنْظُرُوْا فِیْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَیْءٍ o (27) مٹی سے انسان کی تخلیق، انسانوں کے جوڑے بنانے، میاں اور بیوی میں باہم مودت و محبت پیدا کرنے اور انسانوں میں زبانوں اور رنگوں کے اختلاف کو بھی غور و فکر کرنے والوں کے لیے اللہ کی قدرت کی نشانیاں قرار دیا گیا ہے: وَ مِنْ اٰیٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَآ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ o وَ مِنْ اٰیٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ

اَنۡفُسِکُمۡ اَزۡوَاجًا لِّتَسۡکُنُوۡۤا اِلَیۡھَا وَ جَعَلَ بَیۡنَکُمۡ مَّوَدَّۃً وَّ رَحۡمَۃً اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ o وَ مِنۡ اٰیٰتِہٖ خَلۡقُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ اخۡتِلَافُ اَلۡسِنَتِکُمۡ وَ اَلۡوَانِکُمۡ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّلۡعٰلِمِیۡنَ o (28) مشاہدہ اور تدبر فی الخلق کی اہمیت کے پیش نظر قرآن نے ان لوگوں کو حیوانوں سے بھی بدتر قرار دیا ہے، جو اپنے قوائے حسی کو مشاہدۂ فطرت اور ذہنوں کو تفکر و تدبر کے لیے استعمال نہیں کرتے :وَ لَقَدۡ ذَرَاۡنَا لِجَھَنَّمَ کَثِیۡرًا مِّنَ الۡجِنِّ وَ الۡاِنۡسِ لَھُمۡ قُلُوۡبٌ لَّا یَفۡقَھُوۡنَ بِھَاوَ لَھُمۡ اَعۡیُنٌ لَّا یُبۡصِرُوۡنَ بِھَا وَ لَھُمۡ اٰذَانٌ لَّا یَسۡمَعُوۡنَ بِھَا اُولٰٓئِکَ کَالۡاَنۡعَامِ بَلۡ ھُمۡ اَضَلُّ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الۡغٰفِلُوۡنَ o (29) عقل کو کام میں نہ لانے والوں کو بدترین خلائق قرار دیا گیا ہے :اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنۡدَ اللّٰہِ الصُّمُّ الۡبُکۡمُ الَّذِیۡنَ لَا یَعۡقِلُوۡنَ o (30) قرآن کریم نے کسی مظہر فطرت کو دیکھ کر اس پر غور وفکر کیے بغیر آگے گزر جانے کو نافرمانوں کی نشانی بتایا ہے :وَ کَاَیِّنۡ مِّنۡ اٰیَۃٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ یَمُرُّوۡنَ عَلَیۡھَا وَ ھُمۡ عَنۡھَا مُعۡرِضُوۡنَ o (31)

ڈاکٹر رفیع الدین کے مطابق کسی مظہر قدرت یا اٰیۃ اللّٰہ پر غور وفکر ترک کر دینا اس سے پہلے کہ اس کی حقیقت پوری طرح منکشف ہو، اس سے اعراض کے زمرے میں آتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان کو یہ حکم ہے کہ جب موجوداتِ قدرت میں سے کوئی چیز اس کے نوٹس میں آئے تو اسے نظر انداز نہ کرے، بلکہ اس کے مشاہدہ اور مطالعہ کا حق ادا کرے، اس کی حقیقت اور اصلیت کو پوری طرح سمجھے، اور خدا کی حکمتیں، جو اس کے اندر پوشیدہ ہیں، ان سے پوری طرح واقف ہونے کی کوشش کرے۔ گویا جب تک کسی چیز کی حقیقت پوری طرح واضح نہ ہو جائے، مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ اپنی تحقیق وتجسس کو جاری رکھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے امت کو سکھائی گئی حسب ذیل دعا بھی اس مطلب کی تائید کرتی ہے :اللّٰھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہ اللّٰھم ارنا الاشیاء کماھی. ''اے خدا! ہم کو صداقت بطور صداقت کے دکھا دے اور اس کی پیروی کرنے کی توفیق دے اور جھوٹ بطور جھوٹ کے دکھا دے اور اس سے بچنے کی توفیق عطا فرما۔ اے خدا! ہمیں اشیاء کو اس طرح سے دکھا دے جیسی وہ درحقیقت ہیں۔'' حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ دعا گویا سائنسی طریق تحقیق کی حمایت کرتی ہے، کیونکہ سائنسی طریق تحقیق، جو اس بات پر زور دیتا ہے کہ مشاہدہ کے نتائج کو کامل احتیاط سے اخذ کیا جائے اور انتہائی طور پر درست کرنے کی کوشش کی جائے، اس کا مقصد یہی ہے کہ اشیا ایسی ہی نظر آئیں جیسی کہ وہ درحقیقت ہیں۔(32)

اشیا کو ان کی اصلی حالت میں دیکھنے اور مشاہدے کے نتائج میں غلطی سے بچنے کے لیے قرآن بہ تکرار صحیفۂ فطرت کے مطالعہ کی دعوت دیتا ہے :اَلَّذِیۡ خَلَقَ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا مَا تَرٰی فِیۡ خَلۡقِ

الرَّحمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ o ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ o (33) قرآن یہاں بار بار نگاہ ڈالنے اور غور و فکر کرنے پر زور دے رہا ہے۔ سائنسی زبان میں یہی چیز مشاہدہ (Observation) اور تجربہ (Experiment) کہلاتی ہے۔ کسی چیز کا بار بار مشاہدہ کرنے اور حالات بدل بدل کر یعنی تجربہ کر کے مطالعہ کرنے اور غور و فکر کر کے گہرے نتائج اخذ کرنے کو سائنسی تحقیق (Scientific Research) کہا جاتا ہے۔

تجربہ اور مشاہدہ کی انتہائی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ پر ایمان مضبوط ہوتا ہے اور اطمینانِ قلب نصیب ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص بندوں کو جو مشاہدہات کرائے، ان کا ذکر بھی قرآن میں موجود ہے۔ ذیل میں دو واقعات ذکر کئے جاتے ہیں: وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى قَالَ اَوَ لَمْ تُؤْمِنْ قَالَ بَلٰى وَ لٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا وَ اعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ o (34) اگرچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی مردوں کو زندہ کرنے کی قدرت کاملہ پر ایمان تھا تاہم انہوں نے اطمینانِ قلب کے لیے مشاہدہ کرنا چاہا تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے چار پرندے لے کر انہیں سدھایا اور پھر ان کو ذبح کر کے ان کا گوشت باہم ملا کر چار پہاڑوں کی چوٹیوں پر رکھ دیا۔ پھر ان کو ایک ایک کر کے آواز دی تو وہ ان کی نگاہوں کے سامنے زندہ ہو گئے۔ دوسرے واقعہ کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے: اَوْ كَالَّذِيْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ وَّ هِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا قَالَ اَنّٰى يُحْيٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَ شَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ وَ لِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ o (35) عزیز علیہ السلام کو بھی اللہ کی قدرت کاملہ پر یقین تھا تاہم جب انہوں نے بستی کو عجیب و غریب حالت میں تباہ شدہ دیکھا تو یہ جاننا چاہا کہ اللہ تعالیٰ اس بستی کو کس کیفیت سے زندہ کرے گا؟ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں مشاہدہ کرانے کے لیے سو برس تک مردہ رکھا۔ پھر ان کو زندہ کر کے پوچھا کتنی مدت تک اس حالت میں رہے ہو؟ وہ بولے کہ دن یا آدھا دن۔ اللہ نے فرمایا نہیں بلکہ سو برس تک اس حالت میں رہے ہو۔ کھانے کو دیکھو وہ بالکل نہیں گلا سڑا اور دیکھو گدھے کی ہڈیوں کو ہم کیسے ترکیب دیتے ہیں؟ اور تمہارے دیکھتے ہی دیکھتے ان پر گوشت چڑھاتے ہیں۔ یہ سب کچھ ہوتا دیکھ کر حضرت عزیز علیہ السلام کو اللہ کی قدرتِ کاملہ پر اطمینانِ قلبی حاصل ہو گیا۔

ان واقعات سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں مشاہدہ اور مطالعہ کائنات پر زور دیا اور بھرپور طریقے سے اس کی دعوت و ترغیب دی وہاں اپنے بندوں کو مشاہدات بھی کرائے۔ چنانچہ مشاہدہ تجربہ اور تدبر فی الخلق کے اعتبار سے بھی قرآن اور سائنس میں ایک واضح تعلق نظر آتا ہے۔

قرآن اور سائنس میں تعلق کی صحیح نوعیت

موجودہ دور سائنس کا دور سمجھا جاتا ہے۔ جدید تعلیم یافتہ افراد کم وبیش ہر قسم کے مسائل میں سائنسی ثبوت کے متقاضی ہوتے ہیں۔ ان کا رویہ قرآن کے حوالے بھی اسی نوعیت کا ہے۔ یہ سوال اکثر سامنے آتا ہے کہ قرآن اور سائنس میں کیا تعلق پایا جاتا ہے؟ کیا قرآن ایسے حقائق کا انکشاف کرتا ہے، جو جدید سائنس کا موضوع تفتیش ہیں؟ کیا قرآنی بیانات اور جدید سائنسی تحقیقات میں مطابقت پائی جاتی ہے؟ اگر سائنسی تحقیقات و انکشافات اور قرآنی بیانات میں ٹکراؤ نظر آئے تو ایک مسلمان کو کیا کرنا چاہیے؟ ذیل میں ہم ان سوالات کے جوابات اور قرآن اور سائنس کے تعلق کی صحیح نوعیت کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔

قرآن اپنے موضوع پر ایک مکمل کتاب ہے

سب سے پہلے ہم یہ دیکھیں گے کہ قرآن کا موضوع اور اس کا حقیقی و اصلی مقصود کیا ہے؟ یہ بات ہمیشہ ذہن میں رہنا چاہیے کہ قرآن کا موضوع انسان ہے۔ وہ انسان کی فطرت کو درست رکھنے اور انحراف کا شکار ہو کر فساد برپا کرنے سے بچانے کا درس دیتا ہے۔ اس کا کام اس نظام کی اصلاح کرنا ہے، جس کے تحت انسان زندگی گزارتا ہے۔ قرآن انسان کے اعتقادات و تصورات، اس کے فہم وشعور اور کائناتِ ہستی میں اس کے لیے درست رویہ اور طرزِ عمل کی راہیں متعین کرتا ہے۔ وہ انسان کے دوسرے انسانوں اور دیگر مخلوقات، نیز انسان اور خدا کے مابین تعلق کے سلسلہ میں اسے رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ سو قرآن اپنے موضوع پر مکمل کتاب ہے اور اپنے موضوع کا پورے طور پر احاطہ کیے ہوئے ہے۔ رہی یہ بات کہ قرآن میں مظاہر فطرت، طبیعی وسماوی حقائق اور سائنسی دلچسپی کے دیگر پہلوؤں کا ذکر بھی ملتا ہے، تو اس کا مقصد دراصل یہ ہے کہ یہ مظاہر اور آیات وعلامات خدا کی ہستی اور قرآن کے اساسی عقائد کے حق میں دلائل فراہم کرنے والی چیزیں ہیں۔ چونکہ انسان کائنات سے متعلق ہے، لہٰذا قرآن انسان کو کائنات کے مزاج، اس کے تخلیق کار سے اس کے ربط اور اس کے مختلف افراد کے درمیان پائی جانے والی ہم آہنگی وغیرہ کا ایک عمومی تصور عطا کرتا ہے، لیکن وہ ان کی جزئیات سے بحث نہیں کرتا، کیونکہ یہ بات اس کے موضوع سے خارج ہے۔ سید قطب لکھتے ہیں: **و ان وظیفته ان ینشئ تصوراً عاماً للوجود و ارتباطه بخالقه، یوفع الانسان فی هذا الوجود و ارتباطه بربه; و ان یقیم علی أساس هذا التصور نظاماً**

للحیاۃ یسمح للانسان ان یستخدم کل طاقاتہ. ومن بینھا طاقتہ العقلیۃ، التی تقوم ھی بعد تنشئتھا، واطلاق المجال لھا لتعمل –بالبحث العلمی– فی الحدود المتاحہ للانسان . و بالتجریب و التطبیق، وتصل اِلیہ من نتائج، لیست نہائیۃ ولا مطلقہ لطبیعۃ الحال." (36)

قرآن کا کام تجربی طریقہ سے سائنس مرتب کرنا نہیں

بعض لوگ قرآن کی شان عظمت پر اظہار عقیدت کرتے ہوئے، اس میں سے تمام سائنسی علوم کی جزئیات نکالنے کی کوشش کرتے ہیں، حالانکہ یہ چیز قرآن کے دائرہ بحث سے خارج ہے۔قرآن سائنسی نظریات کی کتاب ہے اور نہ ہی اس کا کام تجربی طریقے سے سائنس مرتب کرنا ہے۔جن باتوں کی تعلیم دینا قرآن کا اصلی مقصود ہے، ان باتوں کے ضمن میں قرآن قوانین طبیعی سے تعرض ضرور کرتا ہے، مگر جزئیات میں نہیں جاتا اور ایک عمومی تصور دینے کے بعد آگے بڑھ جاتا ہے۔سید قطب رقمطراز ہیں:" ان القرآن لیس کتاب نظریات علمیۃ ولم یجئ لیکون علماً تجریباًکذلک. انما ھو منھج للحیاۃ کلھا منھج لتقویم العقل لیعمل و ینطلق فی حدودہ. و لتقویم المجتمع یسمح العقل بالعمل والانطلاق. دون ان یدخل فی جزئیات و تفصیلات علمیۃ بحتۃ فھذا متروک العقل بعد تقویمہ واطلاق، سراحہ."(37)

ایک طرف قرآن کے بعض پرجوش عقیدت منداس کوشش میں رہتے ہیں کہ اس کے اندر کیمیا، طب، فلکیات وغیرہ علوم کی جزئی معلومات تلاش کریں تو دوسری طرف اس کے بعض نکتہ چیں اس میں سائنسی تحقیقات اور جدید سائنسی علوم کے خلاف باتوں کی ٹوہ میں لگے رہتے ہیں۔ یہ ہر دو قسم کے افراد افراط وتفریط کا شکار ہیں ۔جزئی سائنسی معلومات کا بیان قرآن کا موضوع نہیں اور مسلمہ سائنسی حقائق قرآنی بیانات سے نہیں ٹکراسکتے (جاری ہے)

اسلام اور فکر مغرب

سید خالد جامعی ☆

مولانا وحیدالدین خاں - ایک فکری جائزہ (۲)

جناب خان صاحب مغرب میں علم نفسیات کی ترقی کے بہت بڑے مداح ہیں لیکن Dupre کیا لکھتا ہے پڑھیے:

In the next three chapters I attempt to show why evolutionary psychology is, nevertheless, a largely bankrupt approach to understanding human behaviour.[John Dupre, Human Nature and the Limits of Science, Oxford, p. 15]

عالم اسلام کے کم وبیش تمام جدیدیت پسند مسلم مفکرین جدید سائنس کی مابعدالطبیعیاتی اساسات اور جدید فلسفہ سائنس سے واقف نہیں لیکن یہ کوئی حیران کن بات نہیں ہے کہ دنیا بھر کی یونیورسٹیوں میں کام کرنے والے اعلیٰ ترین سائنس داں بھی سائنس میں مبتلا تو ضرور ہیں لیکن نہیں جانتے کہ سائنس کیا ہے؟ بالکل اسی طرح جس طرح ایک مچھلی پانی میں نہایت اطمینان سے تیرتی تو ہے لیکن نہیں جانتی کہ آبی حرکیات کا علم کیا ہے؟ فلسفہ سائنس کا اہم ترین مفکر Imre Lakatos لکھتا ہے:

Scientists typically understand science about as well as fish understand hydrodynamics. [1978: 62, , n.2. The methodology of Scientific Research Programmes: Philosophical papers Vol 1 Cambridge University Press]

جدید سائنس کے بارے میں اکثر گفتگو کرنے والوں کی علمی استعداد اور مچھلی کی استعداد میں بہت زیادہ فرق نہیں ہے۔ مسئلہ صرف سائنس کا نہیں ہے سوشل سائنس سے متعلق مسائل و مباحث میں بھی مغرب کے بڑے لوگوں کا حال بھی سائنس جیسا ہے امریکی سپریم کورٹ کے جسٹس Polter Stewarts نے ایک مقدمے میں عریانی کے متعلق اسی قسم کے کلمات کہے تھے کہ " میں نہیں جانتا کہ عریانی کیا ہے لیکن جب میں اسے دیکھتا ہوں تو اسے پہچان لیتا ہوں"۔

I know it when I see it

یہی حال سائنس دانوں کا ہے۔ یہی حال ہمارے مولانا خان صاحب کا ہے ماہر جینیات Steven Jone نے اس صورت حال کی وضاحت نہایت خوبصورتی سے کی ہے:

All [scientists] use a shared grammar that allows them to recognize these crafts when they see it.

لہٰذا سائنس کی عظمت، حقانیت، خوبصورتی اور قبولیت کا اصل سبب اس کا فائدہ مند نظر آنا ہے یعنی

اس کی ظاہریت، اس کے مزے، اس سے حاصل سہولتیں، کشید کردہ لذتیں، خوشیوں کے خوشے، مسرتوں کے لمحے ہر ایک کو متاثر کرتے ہیں لیکن سائنس جو کچھ نقصان پہنچا رہی ہے اس کا ادراک ایک عام انسان نہیں حاصل کرسکتا عام انسان بلکہ بہت پڑھے لکھے لوگ بھی یہی سمجھتے ہیں کہ گاڑی، کمپیوٹر، ہوائی جہاز بھی فیکٹریوں میں اسی طرح درختوں پر پیدا ہوتے، اگتے، بڑھتے، پھولتے اور لٹکتے ہیں جس طرح کسی درخت پر آم لگتا ہے، پتہ ابھرتا ہے، کلی پھوٹتی ہے اور غنچہ چٹکتا ہے لیکن اس انسان کو یہ معلوم نہیں کہ اگر AC سے کمرہ ٹھنڈا ہوجاتا ہے تو اس کی گرمی کہاں چلی جاتی ہے اور AC کی گیس اوزون کی تہہ کو کیسے تباہ کرتی ہے، گاڑی کے ٹائر جو گھس جاتے ہیں تو یہ گھس کر کہاں چلے جاتے ہیں؟ کوئی یہ تصور ہی نہیں کرسکتا کہ گھسنے والے ٹائر کا کاربن ہمارے پھیپھڑوں میں ہی سماتا ہے۔ جو زہریلا کوڑا ہم پیدا کررہے ہیں کوڑا اسی زمین اسی سمندر اور اسی آسمان کے نیچے جلایا، بچھایا اور دبایا جارہا ہے لہٰذا اس کوڑے کا اصل نشانہ ہم ہی ہیں عقل انسانی ان حقیقتوں کا ادراک کرنے سے قاصر ہے کہ وہ ظاہر پرست ہے۔ دجال جب آئے گا تو وہ بھی اپنے کمالات سے لوگوں کو متاثر کرے گا۔ لہٰذا سب یہی کہتے ہیں کہ

Science is good & I know it when I see it.

رسل کے خیال میں سائنس کی دو قسمیں ہیں نظری سائنس [Theoritical Science] اور عملی سائنس [Practical Science] نظری سائنس اس دنیا کا فہم حاصل کرنا چاہتی ہے [an attempt to understand this world] اور عملی سائنس اس دنیا کو بدلنے کا علم [an attempt to change the world] ہے۔

یہ سائنس جدید مغربی فلسفے سے برآمد ہوئی۔ یہ فلسفہ خان صاحب کے خیال میں اسلام تو نہیں ہے لیکن اسلام کا حامی ہے اور اس فلسفے سے نکلنے والی سائنس اسلام کی تصدیق، توثیق تائید کرنے والی ہے مسلمان خواہ مخواہ مغربی فکر اور فلسفے اور اس کا حاصل مغربی جدید سائنس سے گھبراتے ہیں۔ مولانا کا یہ دعویٰ محض افسانہ طرازی ہے۔ اس دعوے کی تردید میں تاریخ، فلسفہ اور سائنس وفلسفۂ سائنس سے بے شمار دلیلیں پیش کی جاسکتی ہیں لیکن فی الحال ہم مولانا کے ممدوح برٹرینڈ رسل کی کتاب مغربی فلسفے کی تاریخ کے حصہ اول From the Renaissance to Hume کے باب اول Chapter 1 General characteristics کا اقتباس پیش کررہے ہیں جس میں رسل نے واضح کردیا کہ برکلے کے سوا دیگر فلاسفہ کا خدا کی حقیقت کے بارے میں کیا خیال تھا۔ اس کتاب کا ایک اقتباس پچھلی قسط میں پیش کیا جاچکا ہے جس میں رسل نے واضح کیا تھا کہ سائنسی اور مذہبی علم میں بنیادی نوعیت کا فرق ہے۔ مذہب قطعی مطلق علم کی بات کرتا ہے جبکہ سائنس دلیل کی بنیاد پر تجربے کے ذریعے ارتقاء کا سفر طے کرتی

ہے۔سائنس اور مذہب کا منہاج علمی یکسر مختلف ہے دونوں میں مماثلت ،مطابقت ممکن ہی نہیں ۔ رسل مذہب اور سائنس میں مشترک نکات دیکھنے سے قاصر ہے۔خان صاحب کو اصرار ہے کہ سائنس و مذہب کا علمی طریقہ ایک ہی ہے صرف یہی نہیں بلکہ وحیدالدین خان صاحب کو مغربی فلسفہ بھی عین اسلامی نظر آ تا ہے۔رسل جدید فلسفیوں اور جدید فلسفے کی مذہب اور خدا کے بارے میں آ راء سے متعلق لکھتا ہے

This is very marked in Descartes, who builds up all knowledge from the certainty of his own existence, and accepts clearness and distinctness (both subjective) as criteria of truth.

It is not prominent in Spinoza, but reappears in Leibniz's windowless monads. Locke, whose temperament is thor-oughly objective, is forced reluctantly into the subjective doctrine that knowledge is of the agreement or isagreement of ideas--a view so repulsive to him that he escapes from it by violent inconsistencies. Berkeley, after abolishing matter, is only saved from complete subjectivism by a use of God which most subsequent philosophers have regarded as illegitimate. In Hume, the empiricist philosophy culminated in a scepticism which none could refute and none could accept.

Kant and Fichte were subjective in temperament as well as in doctrine; Hegel saved himself by means of the influence of Spinoza. Rousseau and the romantic movement extended subjectivity from theory of knowledge to ethics and politics, and ended, logically, in complete anarchism such as that of Bakunin. This extreme of subjectivism is a form of madness.

Unlike religion, it is ethically neutral: it assures men that they can perform wonders, but does not tell them what wonders to perform. In this way it is ncomplete. In practice, the purposes to which scientific skill will be devoted depend largely on chance. The men at the head of the vast organizations which it necessitates can, within limits, turn it this way or that as they please. The power impulse thus has a scope which it never had before. The philosophies that have been inspired by scientific technique are power philosophies, and tend to regard everything non-human as mere raw material. Ends are no longer considered;

only the skilfulness of the process is valued. This also is a form of madness. It is, in our day, the most dangerous form, and the one against which a sane philosophy should provide an antidote. The ancient world found an end to anarchy in the Roman Empire, but the Roman Empire was a brute fact, not an idea. The Catholic world sought an end to anarchy in the Church, which was an idea, but was never adequately embodied in fact. Neither the ancient nor the medieval solution was satisfactory--the one because it could not be idealized, the other because it could not be actualized. The modern world, at present, seems to be moving towards a solution like that of antiquity: a social order imposed by force, representing the will of the powerful rather than the hopes of common men. The problem of a durable and satisfactory social order can only be solved by combining the solidity of the Roman Empire with the idealism of Saint Augustine's City of God. To achieve this a new philosophy will be needed.

جناب وحیدالدین خان مغربی فلسفے کی تعریفیں کر رہے ہیں اور اسے اسلام سے ہم آہنگ قرار دے رہے ہیں مگر اس صدی کا اہم ترین پوسٹ ماڈرنسٹ اور مارکسٹ فلسفی جو امریکہ کا سب سے بڑا فلسفی ہے اپنے خطبے Is Philosophy relevent to applied ethics? میں فلسفے کی بدترین حالت کے بارے میں عجیب انکشافات کرتا ہے۔ اگر وہ انکشافات نہ کرتا تب بھی حقیقت یہی ہے کہ دنیا بھر کی جامعات میں فلسفیوں کو سماجی اور فکری انقلاب برپا کرنے کے لیے بھاری تنخواہیں نہیں دی جاتیں۔ ان کو بھاری مشاہرے صرف اس لیے دیے جاتے ہیں کہ وہ ایک خاص دائرہ کے اندر اپنی سرگرمیاں انجام دیں یعنی تعقل غالب سرمایہ دارانہ نظام زندگی اس کے مظاہر وآثار کی علمی تقلید کے دلائل مہیا کریں۔ وہ حاضر و موجود غالب نظام کے تنخواہ دار کارندے ہیں۔ لہٰذا فلسفہ اپنا حسن، اپنی دیوانگی فرزانگی کھو چکا ہے۔ ایک پیشہ ور فلسفی تخلیقی تخیل کاری کا فریضہ انجام نہیں دے سکتا وہ تخلیقی صلاحیت کھو دیتا ہے۔ وہ ایک خاص نظام زندگی کے تابع ہے جس کی پرواز انہی قواعد وضوابط کے مطابق ہے جو اس پر مسلط کر دیے گئے ہیں دوسرے معنوں میں عہد حاضر میں سرمایہ داری نے فلسفہ کے پر کاٹ دیے ہیں فلسفی فکر ونظر کی بلندیوں سے محروم وجود ہے وہ تخلیقی تخیل کے بغیر فلسفہ پیدا نہیں کر سکتا یعنی فلسفہ جب سے یونیورسٹی کے شعبہ فلسفہ میں قید کیا گیا ہے اس کی موت واقع ہوگئی ہے۔ یہ ارسطو، سقراط، بقراط، ہیوم، کانٹ، کارل مارکس جیسے فلسفی پیدا کرنے سے قاصر ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کی تخلیق کردہ یونیورسٹیوں نے فلسفے کو بانجھ کر دیا ہے

گزشتہ دوسو سال سے جب سے سرمایہ دارانہ نظام غالب ہوا ہے اور فلسفی سرمایہ دارانہ نظام کے زرخرید کارندے بن گئے ہیں فلسفہ اپنی توانائی، رعنائی، حسن اور وجود کھو چکا ہے رچرڈ رارٹی صاف صاف لکھتا ہے:

Since then philosophy has gradually lost prestige.

دیگر مغربی فلسفیوں کی طرح رارٹی کا بھی خیال یہی ہے کہ مغرب میں سائنس اور مذہب کے مابین کشمکش کے نتیجے میں مذہب کو عبرتناک شکست ہوئی۔ مذہب اور عقیدے کی شکلیں تبدیل ہوگئیں اس جنگ کے نتیجے میں صرف مذہب ہی نہیں فلسفہ بھی کمزور ہوا ہے۔ مذہب خود کو سائنس کے ثمرات کے مطابق ڈھال رہا ہے۔ اٹھارہویں صدی سے پہلے فلسفہ ان مابعد الطبیعیاتی سوالات کا جواب عقل کی روشنی میں دیتا تھا جن سوالات کا جواب مذہب وحی اور عقل کی روشنی میں مہیا کرتا تھا۔ جب مذہب کو ہی شکست ہوگئی تو مابعد الطبیعیاتی سوالات اہم نہ رہے۔ پوسٹ ماڈرن ازم نے ان سوالات کو ہی ختم کر دیا لہٰذا اٹھارہویں صدی کے بعد کے بڑے فلسفی حقیقت الحقائق اور موت کے بارے میں زیادہ غور و فکر نہیں کرتے۔ یہ بے معنی سوالات ہیں۔ میں کہاں سے آیا؟ یہ میرے شعور سے پہلے کا سوال ہے۔ مرنے کے بعد کہاں جاؤں گا؟ یہ میرے شعور کے خاتمے کے بعد کا سوال ہے۔ اصل زندگی حاضر و موجود کی زندگی ہے جب سوچنے سمجھنے کا رخ یہ ہو تو نتیجہ کیا نکلے گا؟۔ لہٰذا فلسفے کی وہ اہمیت بھی نہ رہی جو مذہب کی وجہ سے فلسفے کو حاصل تھی۔ سائنس سے شکست کھانے کے بعد اب مذہبی عقیدے بھی سائنسی کہانیوں کے مطابق ڈھالے جارہے ہیں رارٹی لکھتا ہے:

Religious faith has been revised by most educated believers so as not to conflict with the stories scientist tell.

رارٹی لکھتا ہے کہ علمی دنیا نے اس کائنات کی مادی توجیہہ کے نظریے کو قبول کرلیا ہے۔ دنیا کو اب صرف سائنسی علمیت کے تناظر میں دیکھا جارہا ہے۔ علم صرف وہ ہے جو تجربیت وعقلیت کے معیارات پر اترے Metaphysics of Presence حاضر و موجود کی مابعد الطبیعیات ہی جب درست ہے تو اس مادی دنیا میں عیسائیت یہودیت اور افلاطونیت (پلاٹون ازم) اور فلسفہ اخلاقی مثالیت ('مورال آئیڈیل ازم) کا کیا مقام باقی رہ جاتا ہے؟

How can the moral Idealism common to Platonism, Judasim & Chirstanity survive after we have accepted a materialist account of the way the universe works? What is the place of moral ideals in a clock work universe?

رارٹی لکھتا ہے کہ عہد حاضر میں یہ تصور کہ انسان کون ہے؟ انسان کا خاصہ کیا ہے؟ وہ دیگر مخلوقات سے الگ اور خاص کیوں ہے یہ سوالات بہت زیادہ اہم نہیں رہے۔ ان سوالات کی جگہ اب دوسرے دو سوالوں نے لے لی ہے۔ پہلا سوال سیاسی ہے اور دوسرا سوال انسان کے وجود سے متعلق ہے۔ وہ دو

سوال کیا ہیں؟ اس پر ہم مضمون کی اگلی قسط میں گفتگو کریں گے۔ فی الحال جدید دنیا اور جدید فلسفے کے بارے میں اب تک رارٹی کے حوالے سے جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ رارٹی کے الفاظ میں پڑھیے:

Philosophy has a glorious past and an un certain future. That is why, when thinking about our role in intellectual life, we philosophy Professors prefer to look backward. Doing so lets us see ourselves as the successors of Plato, S t. Augustine, Spinoza, Kant, Marx, and Nietzsche. Those men imagined new shapes that the lives of individuals and communities might assume. Thinking of ourselves as their heirs helps us imagine that we might shape the human future. When we turn from the past to the present, however , we remember that we are not being paid to foment intellectual or social revolutions. We have been hired by colleges and universities to be responsible professionals, content to work within a well-defined area o f expertise. As philosophy became one more academic discipline, it became harder for philosophers to do something bold and original .

The professionalization of philosophy began about two hundred years ago, in a period when the modern research university was beginning to take shape. That period ,the time of Hegel and Humboldt, was also philosophy's acme. Since then, philosophy has gradually lost prestige. It has become invisible to the general public, and has drifted off the radar screens of most intellectuals. The principal reason for this marginalization is that the so-called" warfare between science and theology" has tapered off. By and large, science has triumphed. Despite occasional flare-ups, such as the current assault on Evolutionary biology, most Westerners who read books are content to let their view of the universe be shaped by the natural sciences. Religious faith has been revised, b y most educated believers, so as not to conflict with the stories scientists tell. As long as the warfare between science and theology lasted, there was an important role for philosophical theories to play. F or thinkers like Hobbes, Spinoza, Hume, K ant, Hegel, Mill, and Marx all confronted an urgent question :how can the moral idealism common to Platonism, Judaism, and Christianity survive after we have accepted a materialist account

of the way the universe works? What is the place of moral ideals in a clock work universe? A s long as those questions dominated intellectual life, philosophical theories about the nature of reality and about the scope of the limits of human knowledge were still relevant to felt needs. The question of whether human beings were more than just clever animals remained urgent.
The best answer to these questions, I think, is that individuals become aware of more alternatives, and there fore wiser, as they grow older. The human race as a whole has become wiser as history has moved along. The source of these new alternatives is the human imagination. It is the ability to come up with new ideas, rather than the ability to get in touch with un changing essences, that is the engine of moral progress. John Dewey quoted with approval Shelley's dictum that morality only "arranges th e elements that poetry has created. ''[R. Rorty., Is philosophy Relevent to Applied ethics? [Business Ethics Quarterly, p. 369, 370, 171, Volume 16, Issue 3, 2006]

رارٹی اس جدید دنیا، جدید فلسفے، جدید سائنس، جدید فلسفیوں اور جدید کائنات کے بارے میں ہمیں کچھ اور بتا رہا ہے لیکن مولانا وحید خان کا اصرار ہے کہ مغرب کا جدید فلسفہ، اس فلسفے سے نکلنے والی ٹکنالوجی، اس ٹکنالوجی سے تعمیر ہونے والی نئی دنیا، اس دنیا میں پیدا ہونے والا انسان، اس کے ادارے، اس کے ارادے سب اسلام، قرآن، مذہب کی موافقت کرتے ہیں۔ یہ محض مغرب پر ایمان بالغیب کا معاملہ ہے۔ خان صاحب کے مغرب پر ایمان کی کوئی عقلی منطقی بنیاد نہیں ہے۔ ایک ایمان کی جگہ دوسرے ایمان نے لے لی ہے کیونکہ ایک سینے میں دو دل جمع نہیں ہو سکتے یہ قرآن کا فیصلہ ہے۔ مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ [الاحزاب:۴] اس صدی کا اہم ترین فلسفی فوکالٹ لکھتا ہے کہ ایک ڈسکورس کی جگہ دوسرا ڈسکورس ہی لے سکتا ہے یعنی دو ڈسکورس ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔ خان صاحب اسلام اور مغربی فلسفے کے دو مختلف مناہج دو مختلف ڈسکورس کو ایک جگہ جمع کرنا چاہتے ہیں تاکہ مسلمان فرعون کی طرح عالی شان مادی زندگی سائنس کے ذریعے بسر کر سکیں لیکن اسی عظیم الشان مادی ترقی کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے اندر قرن اول کی زبردست روحانیت بھی حلول کر جائے تاکہ آخرت میں وہ حضرت موسیٰ ؑ کے ساتھ اٹھائے جائیں اور انہیں کی طرح انعام پائیں۔ (جاری ہے)

اسلام اور پاکستان فصیح احمد

دینی رسالوں کو ہائیڈ پارک نہیں بننا چاہیے (آخری قسط)

جاوید غامدی جیسے شخص کے گمراہ کن افکار کی اشاعت کا کوئی جواز نہیں

۴۔ غامدی صاحب سنت کو دین کا ماخذ تسلیم کرتے ہیں لیکن قانون شریعت کا ماخذ تسلیم نہیں کرتے۔ ہمارا اعتراض یہ ہے کہ اصلاً وہ سنت کو دین کا ماخذ ہی تسلیم نہیں کرتے اس لیے کہ سنت کی تعریف ان کے ہاں مسلسل بدلتی رہتی ہے مثلاً میزان حصہ اول ۱۹۸۵ء میں سنت کی تعریف کچھ اور تھی لیکن میزان طبع ۲۰۰۲ء میں سنت کی تعریف کچھ اور ہوگئی۔ اصول و مبادی طبع ۱۹۹۵ء میں سنتوں کی تعداد کچھ اور تھی لیکن میزان طبع ۲۰۰۸ء میں سنتوں کی تعداد کچھ اور ہوگئی۔ غامدی صاحب کی سرپرستی میں ان کے اداروں دارالاشراق دانش، سراء اور المورد سے دانش سراء کے صدر ڈاکٹر فاروق احمد خان کی کتاب اسلام کیا ہے؟ طبع اول ۱۹۹۷ء، طبع دوم ۱۹۹۸ء، طبع سوم ۱۹۹۹ء، طبع چہارم ۲۰۰۰ء طبع ہوتی رہی اور اس میں سنتوں کی تعریف اور تعداد بھی مسلسل مستقل بدلتی رہی۔ یہ کتاب غامدی صاحب کے مذہب کی سرکاری ترجمان تھی۔ غامدی صاحب کے قائم کردہ ادارے ''دانش سرا'' کے تحت اس کتاب کے دو لاکھ نسخے علمی حلقوں میں مفت تقسیم کیے گئے۔ غامدی صاحب کے مکتب فکر میں میزان سے پہلے اسے انجیل کا درجہ حاصل تھا لیکن ۲۰۰۲ء میں جب میزان شائع ہوئی تو اس کتاب کی تب و تاب برقرار نہ رہی۔ اس کتاب کی طبع اول ۱۹۹۷ء میں سنت کے زیر عنوان ڈاکٹر فاروق خان صاحب غامدی صاحب کے افکار کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''سنت رسول کا وہ طریقہ یا راستہ جسے آپؐ نے ملت ابراہیمی کے اتباع میں دین کی حیثیت سے جاری کیا۔ سنت امت کو صحابہ کے اجماع اور عملی تواتر سے منتقل ہوئی ہے۔ تمام صحابہ اس بات پر متفق تھے کہ فلاں عمل سنت ہے۔ یہ عملی چیزوں پر مشتمل ہے۔ سنت امت کی متفقہ عملی شہادت سے ملی ہے۔ بعض معاملات میں حضورؐ نے مختلف طریقوں پر عمل کی اجازت دی اس لیے ایسے سب طریقے سنت کا حصہ ہیں۔ اس موضوع پر ڈاکٹر جواد علی کی کتاب 'المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام' اور شیخ خضری بک کی کتاب تاریخ الشریع الاسلامی میں تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ رسولؐ نے تمام عبادات کی عملی صورت گری کر کے دکھائی۔ قرآن وسنت ایک ہی سرچشمۂ قدرت یعنی اللہ کی طرف سے نازل ہوئی ہیں اور ان میں اختلاف ممکن نہیں ہے۔ سنت قرآن حکیم کے احکام اور اصولوں کی تشریح و وضاحت ضرور کر سکتی ہے یہی اس کا اصل کام ہے [باب پانچ سنت ص ۱۱۲ تا ۱۲۰ اسلام کیا ہے؟ ڈاکٹر فاروق خان دارالاشراق طبع اول اکتوبر ۱۹۹۷ء لاہور]۔ واضح رہے کہ اس وقت تک غامدی صاحب نے سنتوں کی تعداد کا تعین

نہیں کیا تھا۔ تحقیق جاری تھی۔

اسلام کیا ہے؟ طبع سوم ۱۹۹۹ء کے پیش لفظ میں ناظم دانش سرا منظور الحسن نے اس کتاب کو مکتب جاوید غامدی کے ترجمان کی حیثیت سے پیش کیا اور حرف اول میں ڈاکٹر فاروق صاحب نے کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں عبدالحئی عابد، معز امجد، رفیع مفتی، ساجد حمید، طالب محسن اور غامدی صاحب کے صاحب زادے جواد احسن کا شکریہ ادا کیا۔ یہ سب غامدی صاحب کے حواریین ہیں۔ دانش سرا غامدی صاحب کا قائم کردہ ادارہ تھا۔ اس ادارے کے تحت غامدی صاحب کی سرپرستی میں شائع ہونے والی کتاب میں سنت کی تعریف اس طرح کی گئی ہے ''تمام صحابہ اس بات پر کاملاً متفق تھے کہ فلاں عمل سنت ہے اور وہ سارے کے سارے یا ان کی ایک کثیر تعداد اس پر کاربند بھی تھی لہٰذا یہ بات بالکل قطعی ہے کہ ثبوت کے اعتبار سے اس میں اور قرآن میں کوئی فرق نہیں۔ سنت صحابہ کے اجماع اور عملی تواتر سے ملی ہے اور قرآن ہی کی طرح یہ ہر دور میں امت کے اجماع سے ثابت قرار پائے گی [اسلام کیا ہے؟ ڈاکٹر فاروق خان، ص ۱۴۵، طبع سوم ۱۹۹۹ء، دانش سرا لاہور] سنت تمام تر عملی چیزوں پر مشتمل ہے سنت میں کیا کچھ شامل ہے؟ سنت سے ہمیں جو دین ملا ہے وہ زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق عملی رہنمائی ہے (ص ۱۴۶، ۱۴۷)۔ اس کے بعد فاروق صاحب نے ص ۱۴۷ پر سنت کی تعداد کی تفصیل دی ہے اور کل سنتیں ۳۹ بیان کی ہیں (ص ۱۴۷ محولہ بالا) جس عمل پر مکمل اتفاق ہو وہ تو سنت ہے جس پر اتفاق نہ ہو وہ سنت کا حصہ نہیں (ص ۱۴۷، ۱۴۸)۔ سنت پر صحابہ کرام کا کامل اجماع تھا [ص ۱۴۹]۔ سنت قرآن حکیم کے احکام اور اصولوں کی تشریح و وضاحت کر سکتی ہے اور یہی اس کا اصل کام ہے۔ قرآن کی تشریح و وضاحت کا حق خود اللہ نے حضورؐ کو دیا ہے۔ [ص ۱۵۵]

ڈاکٹر فاروق کی کتاب ''اسلام کیا ہے؟'' دانش سرا نے طبع چہارم ۲۰۰۰ء میں شائع کی تو حرف اول میں انہوں نے اعتراف کیا ''دین کے مشکل سوالات کے جواب میں میں نے سب سے زیادہ استفادہ اپنے استاد جاوید غامدی صاحب سے کیا ہے۔ اس کتاب میں آپ دین کا جو واضح تصور دیکھیں گے؟ اس میں سب سے زیادہ حصہ انہی کا ہے [ص ۱۴۴ اسلام کیا ہے طبع چہارم ۲۰۰۰ء ادانش سرا لاہور]۔ اس اعتراف میں چار سال کیوں لگے؟ غور و فکر کیجیے تو وجہ سمجھ میں آ جائے گی۔ غامدی صاحب کی سرپرستی میں شائع ہونے والی یہ کتاب جو ان کے ادارے دانش سرا کے ذریعے لوگوں میں دین کی دانش عام کرنے کے لیے شائع کی گئی اس میں سنتوں کی تعداد ۳۹ تھی۔ اس سے پہلے سنتوں کی فہرست میں داڑھی شامل تھی مگر بعد میں وہ فطرت کا حصہ بن گئی میزان طبع سوم مئی ۲۰۰۸ء میں داڑھی رکھنا دین کا حکم ہے لیکن داڑھی بڑھانا دین کا حکم نہیں (ص ۲۳۵)۔ رسولؐ نے فرمایا کہ داڑھی بڑھائیں لیکن مونچھیں ہر حال میں چھوٹی رکھیں (ص ۲۳۵ میزان طبع پنجم فروری ۲۰۱۰ء)

۵۔ مشکٰوۃ میں آتا ہے'**ان هذا العلم دين فانظرو اعمن تاخذون دينكم**' یہ علم ہی تمہارا دین ہے تو یہ دیکھ لو کہ کس (شخصیت) سے تم دین اخذ کر رہے ہو۔ جب ہم غامدی صاحب کو الشریعہ کے صفحات پر اپنا نقطہ نظر پیش کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو بنیادی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایسے شخص سے دین اخذ کرنا یا ایسے فرد کے اخذ کردہ دین کی تشہیر و اشاعت ایک راسخ العقیدہ دینی رسالے میں کرنا جائز کام ہے جو ساقط الاعتبار، کذاب، مجہول الفکر اور مجہول الذہن ہو۔ بات بہ ظاہر بہت سخت ہے لیکن حدیث کے راویوں کی نقد و جرح کرتے ہوئے ان اصطلاحات کو بغیر کسی تکلف کے استعمال کیا جاتا ہے اور خود غامدی صاحب نے امام زہری جیسے عظیم راوی کے بارے میں یہی کچھ لکھا ہے اور ان کے استرداد کے لیے میزان ۲۰۱۰ء میں جو کچھ لکھا ہے وہ یہ ہے:

ابن شہاب زہری کو ائمہ رجال تدلیس اور ادراج کا مرتکب تو قرار دیتے ہی ہیں اس کے ساتھ اگر ان کے وہ خصائص بھی پیش نظر رہیں جو امام لیث بن سعد نے امام مالک کے نام اپنے ایک خط میں بیان فرمائے ہیں تو ان کی کوئی روایت بھی اہم معاملات میں قابل قبول نہیں ہوسکتی۔ وہ لکھتے ہیں اور جب ہم لوگ ابن شہاب سے ملتے تھے تو بہت سے تضادات سامنے آتے اور ہم میں سے کوئی جب ان سے لکھ کر دریافت کرتا تو علم و عقل میں فضیلت کے باوجود ایک ہی چیز کے متعلق ان کا جواب تین طرح کا ہوا کرتا تھا جن میں سے ہر ایک دوسرے کا نقیض ہوتا اور انھیں اس بات کا احساس ہی نہیں تھا کہ وہ اس سے پہلے کیا کہہ چکے ہیں۔ (میزان ص ۳۱،۳۲، طبع ۲۰۱۰ء لاہور)

اگر امام زہری ان خصائص کے پیش نظر لائق اعتناء نہیں ہیں تو غامدی صاحب میں یہی خصائص ہو بہو موجود ہیں مثلاً حضرت والا کے اپنی عمر کے بارے میں متضاد بیانات، میزان کے بارے میں متضاد تاریخوں کا اظہار، ۲۰۰۴ء میں مقامات شائع کرنے کے بعد اسے غائب کرا دینا اور نئی اشاعت پر طبع اول ۲۰۰۸ء لکھ کر قارئین کو دھوکہ دینا جیسے یہ کتاب پہلی مرتبہ ۲۰۰۸ء میں شائع ہو رہی ہے۔ ایک طرف یہ ظاہر کرنا کہ ۱۹۷۳ء میں اصلاحی صاحب کی شاگردی اختیار کرنے کے بعد ہر ایک سے رشتہ منقطع کر کے صرف اسی دروازے کے ہو گئے تھے لیکن اسی دوران جماعت اسلامی کی رکنیت اختیار کرنا اور مرید کے میں اپنی اکیڈیمی قائم کر لینا وغیرہ وغیرہ۔ امام زہری کی طرح غامدی صاحب بھی ایک ہی چیز کے متعلق کئی جواب دیتے ہیں۔ اس کا ثبوت درج ذیل ہے:

(۱)　میزان طبع سوم ۲۰۰۸ء کے ''خاتمے'' میں لکھتے ہیں اللہ کا شکر ہے کہ اس کتاب کی تصنیف کا کام جو میں نے ۱۹۹۰ء بمطابق ۱۴۱۰ ہجری میں کسی وقت شروع کیا تھا وہ آج سترہ سال بعد پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا ہے [ص ۶۳۵، طبع سوم مئی ۲۰۰۸ء]۔ میزان طبع پنجم فروری ۲۰۱۰ء میں خاتمہ کا صفحہ نمبر ۶۵۰ ہے

یعنی میزان جدید میں پندرہ صفحات کا اضافہ ہوگیا۔صرف اضافہ ہی نہیں ہوا کئی صفحات نکال دیے گئے۔وہ حدیث بھی نکال دی گئی جو۲۰۰۸ء کی اشاعت میں شامل تھی کہ مسجد میں جوتے پہن کر نماز پڑھنا سنت ہے لیکن پہلے باب کی سنتوں والی فہرست میں اس سنت کا ذکر تک نہیں تھا۔میزان کی نئی اشاعت میں کہیں یہ درج نہیں ہے کہ یہ ترمیم شدہ، تصحیح شدہ یا نظر ثانی شدہ اشاعت ہے۔میزان ۲۰۰۸ء میں نومولود کے کان میں اذان سنت تھی[ص۱۴ رسوم آداب میں چوتھے نمبر کی سنت] میزان ۲۰۱۰ء میں سنتوں کی فہرست سے نومولود کے کان میں اذان کی سنت نکال دی گئی لیکن دیباچے میں یا پیش لفظ میں یا سرورق پر کہیں نظر ثانی شدہ اشاعت کا ذکر نہیں کیا گیا۔علمی حلقوں میں اور کتابوں کی دنیا میں اسے بددیانتی سمجھا جاتا ہے۔مولف یا مصنف اگر کتاب پر نظر ثانی کر رہا ہے یا اس کی تصحیح کرتا،اضافے کرتا یا کمی کرتا ہے تو اس پر لکھا جاتا ہے کہ یہ ترمیم شدہ اشاعت Revised Edition ہے۔غامدی صاحب خاموشی سے اپنی اصلاح کر لیتے ہیں، اپنے موقف بدلتے ہیں، اپنی دلیل، رائے، خیال میں ارتقاء لے آتے ہیں لیکن کسی پر ظاہر نہیں کرتے۔یہ اخفاء کس درجے کا جرم ہے؟

(۲) غامدی صاحب کا یہ بیان کہ میزان کی تصنیف کا کام ۱۹۹۰ء میں شروع کیا گیا صریحاً کذب بیانی ہے۔میزان لکھنے کا کام ۱۹۸۰ء سے بھی پہلے شروع ہوا تھا،اس کا ثبوت 'میزان' حصہ اول طبع اول ۱۹۸۵ء ہے جس کا ذکر غامدی صاحب نے جان بوجھ کر نہیں کیا کیونکہ اس 'میزان' میں ان کے افکار اہل سنت والجماعت کے دائرے سے قریب تر تھے۔میزان حصہ اول ۱۹۸۵ء کے بیشتر مضامین اور مباحث میزان ۲۰۰۸ء میں حرف بہ حرف موجود ہیں مثلاً نبی اور رسول کا فرق،قانون،میراث،رجم کی سزا دیت اور شہادت۔میزان حصہ اول ڈاکٹر منیر احمد ناشر نے شعبان ۱۴۰۵ ہجری/مئی ۱۹۸۵ء میں دارالاشراق ۱۷۹ابی ابوبکر بلاک نیوگارڈن ٹاؤن لاہور سے شائع کی۔کتاب پر مولف کا نام جاوید احمد الغامدی درج ہے۔اس کے تمام مباحث وہی ہیں جو میزان ۲۰۱۲ء میں بھی موجود ہیں۔کتاب کے مقدمہ میں اجتہاد سے متعلق حضرت معاذ بن جبلؓ کی حدیث درج کر کے لکھتے ہیں ''میں نے اس کتاب کے مباحث میں اسی طریقے کی پیروی کی ہے، جاوید المورد لاہور شعبان ۱۴۰۵ ہجری۔گویا میزان غامدی صاحب نے ۱۹۷۹ء میں لکھنا شروع کر دی تھی اور ۱۴۰۵ ہجری ۱۹۸۵ء میں میزان کا ایک حصہ میزان حصہ اول کے نام سے شائع ہوگیا تھا اور ۱۹۷۹ء کا مضمون قانون سیاست ۱۹۹۳ء میں غامدی صاحب نے ناشر کی حیثیت سے خود شائع کر دیا تھا۔اگر غامدی صاحب نے میزان ۱۹۹۰ء میں لکھنی شروع کی تو وہی خیالات وافکار لکھنے سے پہلے ہی ۱۹۸۵ء میں غامدی صاحب کے نام سے اور غامدی صاحب کے ادارے سے ہی کیسے شائع ہوگئے؟ یہ تدلیس ہے یا نہیں؟ ۱۴۰۵ ہجری میں میزان شائع ہوگئی لیکن ۲۰۰۸ء میں لکھ رہے ہیں کہ میزان کی تحریر کا آغاز ۱۴۱۰ ہجری سے ہوا۔

(۳) میزان جس کے بارے میں غامدی صاحب کا دعویٰ ہے کہ ۱۹۹۰ء میں میزان لکھنے کا آغاز کیا گیا، اس کا ایک باب قانون سیاست اصلاً ۱۹۷۹ء میں لکھا جا چکا تھا اور غامدی صاحب نے اپنے ادارے دارالاشراق ۹۸ (۲) ای ماڈل ٹاؤن لاہور سے بحیثیت ناشر خود مارچ ۱۹۹۳ء میں اسے شائع کرایا۔ اس شائع شدہ کتابچے کا نام ہے ''سیاست ومعیشت'' از جاوید احمد غامدی''۔ اس کتابچے کا پہلا مقالہ قانون سیاست ہے جو ص ا سے شروع ہو کر ص ۷۴ پر ختم ہوتا ہے۔ اختتام پر اس مقالے کا سن تحریر ۱۹۷۹ء درج ہے۔ یہی مقالہ اب اضافوں، ترامیم، اصطلاحات، تحریفات، تدلیسات کے ساتھ میزان ۲۰۰۸ء اشاعت اول میں شامل کر دیا گیا۔ سوال یہ ہے کہ میزان کا آغاز ہی ۱۹۹۰ء میں ہوا تو میزان کا باب قانون سیاست ۱۹۷۹ء میں مکمل ہو کر ۱۹۹۳ء میں غامدی صاحب نے خود ہی کیسے شائع کر دیا۔ یہ جھوٹ، کذب، تدلیس، التباس فاحشہ کے سوا اور کیا ہے؟ اس کتابچے کے دیباچے میں جولائی ۱۹۹۲ء المورد لاہور کی تاریخ درج ہے لکھتے ہیں ''میری کتاب میزان دین کے انہی اجزاء کی تفصیل میں ہے، سیاست ومعیشت کے زیر عنوان یہ مضامین اسی کتاب سے لیے گئے ہیں [دیباچہ سیاست ومعیشت جاوید غامدی ص نمبر ندارد مارچ ۱۹۹۳ء، دارالاشراق ۹۸ (۲) ای ماڈل ٹاؤن لاہور ناشر جاوید احمد غامدی] ''قانون سیاست'' کے نام سے غامدی صاحب نے اسی مقالے کو ترمیم واضافوں کے ساتھ المورد کے زیر اہتمام مئی ۲۰۰۵ء میں شائع کیا تو اس تحریر سے ۱۹۷۹ء کا سن غائب کر دیا گیا، دیباچہ بھی بدل دیا گیا۔ اب تاریخ المورد لاہور ۱۲ اپریل ۲۰۰۵ء ہو گئی۔ لکھتے ہیں کم وبیش ربع صدی کے مطالعہ وتحقیق سے میں نے اس دین کو جو کچھ سمجھا ہے۔ اپنی کتاب میزان میں بیان کر دیا ہے یہ اسی کتاب کا ایک باب ہے''۔ تاریخوں کا یہ طلوع وغروب کس مرض کی نشان دہی کر رہا ہے؟ غامدی صاحب صادق ہیں یا کاذب دین میں صدق کو کیا اہمیت ہے؟ غامدی صاحب میزان میں اخلاقیات کے تحت صدق کے عنوان پر لکھتے ہیں:

''چوتھی چیز صدق ہے۔ یہ قول وفعل اور ارادہ تینوں کی مطابقت کی تعبیر کے لیے آتا ہے کہ آدمی کے منہ سے کوئی حرف صداقت کے خلاف نہ نکلے۔ اس قول وفعل میں کوئی تضاد نہ ہو اور وہ اپنی ہر بات کو نباہ دے تو یہ زبان وعمل کی سچائی ہے۔ [ص ۲۴۶ میزان طبع سوم مئی ۲۰۰۸ء المورد، لاہور] ایمان کے بعد دین کا اہم ترین مطالبہ تزکیہ اُخلاق ہے اور اس کے معنی ہیں کہ انسان خلق اور خالق دونوں سے متعلق اپنے عمل کو پاکیزہ بنائے۔ یہی وہ خیر ہے جسے عمل صالح سے تعبیر کیا جاتا ہے تمام شریعت اسی کی فرع ہے۔ ایمان اور عمل صالح اصل دین ہیں، ان میں ترمیم وتغیر کبھی نہیں ہوا۔ [میزان ص ۱۹۷ محولہ بالا] قرآن اس معاملے میں بالکل واضح ہے کہ جو شخص ان دونوں کے ساتھ اللہ کے حضور میں آئے گا اس کے لیے جنت ہے۔

غامدی صاحب سے جو لوگ دین اخذ کر رہے ہیں وہ بتائیں کہ کیا غامدی صاحب کے اپنے بتائے

ہوئے اصول، اپنے اختیار کردہ طریقے یعنی دروغ گوئی، اپنے فرمودہ صدق کی اہمیت کے بعد کیا ان سے دین اخذ کیا جا سکتا ہے؟ پاکیزگی اور عمل صالح سے محروم ہستی کیا دین کا علم تقسیم کرنے، عام کرنے کی مجاز بھی ہے؟ بات سخت ہے لیکن اگر غامدی صاحب امام زہری جیسے عالم کے بارے میں جرات اور بے باکی کا مظاہرہ کر سکتے ہیں تو کم از کم غامدی صاحب کی اتباع میں راقم اس جرات کا ارتکاب کرتے ہوئے کسی قسم کی پشیمانی محسوس نہیں کرتا۔

(۴) میزان حصہ اول ۱۹۸۵ میں سنت کے بارے میں غامدی صاحب لکھتے ہیں ''سنت قرآن کے بعد دین کا دوسرا قطعی ماخذ ہے۔ یہ اصول ناقابل انکار علمی حقیقت کی حیثیت رکھتا ہے۔ قرآن اس معاملے میں واضح ہے کہ محمد ﷺ کے احکامات واقدامات قیامت تک کے لیے اسی طرح واجب الاتباع ہیں جس طرح خود قران واجب الاتباع ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم محض نامہ بر نہ تھے رسول کی حیثیت سے آپ ﷺ کا ہر قول اور فعل بجائے خود قانونی سند وحجت کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ کو یہ مرتبہ کسی امام وفقیہ نے نہیں دیا ہے خود قرآن نے آپ کا یہ مقام بیان فرمایا ہے کہ کوئی شخص جب تک صاف صاف قرآن کا انکار نہ کردے اس کے لیے سنت کی قانونی حیثیت کو چیلنج کرنا ممکن نہیں ہے۔ سورہ حشر کی آیت ۷ غیر مبہم الفاظ میں اس مسئلے کو بیان کرتی ہے۔ [ص ۸۰ میزان اول طبع ۱۹۸۵ دار الاشراق لاہور] سنت ہر اس معاملے میں جس میں قرآن خاموش ہے، بجائے خود ماخذ قانون کی حیثیت رکھتی ہے۔ کوئی چیز قرآن میں ہے تو سنت صرف اس کی تبیین کر سکتی ہے۔ سنت کے لیے یہ اختیار خود قرآن سے ثابت ہے، النحل آیت ۴۴ ملاحظہ کیجیے۔ [ص ۸۲،۸۳ میزان حصہ اول] قرآن ۱۹۸۵ء میں بھی وہی تھا اور ۲۰۰۸ء میں بھی وہی ہے لیکن اسی قرآن سے اب یہ ثابت کیا جا رہا ہے کہ سنت کا قرآن سے کوئی تعلق نہیں ہے، وہ دین ابراہیمی کی روایت ہے اور سنتوں کی تعداد متعین ہے، اس میں قران کی آیات کی طرح کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔

(۵) غامدی صاحب نے سنت سے متعلق اپنا جدید نقطہ نظر پہلی مرتبہ کراچی دانش سرا کے تحت بہادر آباد میں 'دین حق - چند اہم مباحث' کے زیر عنوان ۱۹ مارچ سے ۲۸ مارچ ۱۹۹۸ء تک محاضرات کی صورت میں پیش کئے۔ ان نشستوں میں راقم شریک تھا۔ وہیں اس کی ملاقات شعبہ تصنیف وتالیف و ترجمہ کے ناظم سید خالد جامعی صاحب سے ہوئی جو غامدی صاحب کے ساتھ تشریف لائے تھے۔ دونوں کے ذاتی تعلقات پہلی دفعہ راقم کے علم میں آئے۔ اس وقت غامدی صاحب کا اصل چہرہ سامنے نہیں آیا تھا۔ ان محاضرات نے بہت سے نقاب الٹ دیئے۔ محاضرات کی ریکارڈنگ کے مطابق غامدی صاحب نے فرمایا ''کتابوں میں یہ بات لکھ دینی چاہیے کہ دین کا ایک ہی ماخذ ہے وہ ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ انہوں نے جس کو دین کہا وہی دین ہے۔ صحابہ کا قولی تواتر، اجماع، نسلاً بعد نسلاً امت تک

قرآن کا منتقل ہونا یہ تین چیزیں اجماع امت بن جاتی ہیں۔امت اس کتاب کے فہم پر اجماع نہیں کر رہی ہے بلکہ اس کے لفظی طور پر رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے پر اجماع کر رہی ہے۔اجماع دین کے منتقل ہونے کا ایک ذریعہ ہے اور دین کیا، دنیا بھر میں تاریخ اور زبان معلومات اسی طریقے سے منتقل ہوتی ہیں۔ سنت کیا ہے؟ اس پر غور کریں تو سنت مقدم ہو جاتی ہے۔قرآن موخر ہو جاتا ہے سنت قرآن کی طرح ہر دور میں امت کے اجماع سے ثابت قرار پائی ہے۔قرآن کے بارے میں معلوم ہے کہ یہ ۶۶۶۶ آیات کا مجموعہ ہے۔سنت کی تعریف کو نظر میں رکھ کر جب ہم امت کے علمی ذخیرے کا جائزہ لیتے ہیں تو جیسے قرآن بالکل محکم طریقے سے مل جاتا ہے ویسے ہی سنت بھی محکم طور پر مل جاتی ہے یعنی سنت کی فہرست لکھوائی جاسکتی ہے کہ یہ سنت ہے۔اس فہرست میں صرف چالیس سنتیں شامل ہیں جن پر صحابہ کا اجماع عملی ہے۔سنت وہ ہے جسے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کی حیثیت سے جاری کیا اس پر پوری امت کا اجماع ہو گیا۔سنت میں اختلاف کیسے ہو جائے گا؟ جیسے ہی اختلاف ہوگا وہ چیز سنت ثابت نہیں ہوگی اجماع اس کی لازمی شرط ہے۔جیسے قرآن میں کوئی اختلاف نہیں ہوسکتا سنت میں بھی کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا[محاضرات ۱۹مارچ تا ۲۸مارچ ۱۹۹۸دانش سرا کراچی،سنو وائٹ چیمبر بہادر آباد پہلی منزل کراچی]۔

اس وقت دانش سرا کراچی کے صدر ڈاکٹر طارق سجاد صاحب، جو کہ بعد میں دانش سرا پاکستان کے صدر بنائے گئے اور غامدی صاحب کے میزبان سنو وائٹ کے جناب شکیل الرحمٰن صاحب نے یہ محاضرات ماہ نامہ'ساحل' کراچی اپریل اور مئی کے شماروں میں شایع کروا کر بڑی تعداد میں تقسیم کیے اور ان پر تنقید کی دعوت دی گئی۔ جناب طارق سجاد صاحب نے اس کے چند نسخے مجھے بھی عنایت کیے تھے جو فی الحال دستیاب نہیں غالباً انہی محاضرات کے بعد سید خالد جامعی اور جناب غامدی صاحب کے تعلقات میں کشیدگی کا آغاز ہوا۔شکیل الرحمٰن صاحب کے گھر پر غامدی صاحب کے ساتھ جامعی صاحب کی کئی علمی نشستیں ہوئیں لیکن غامدی صاحب ان کے سوالات، شبہات اور اعتراضات کا کوئی جواب نہیں دے سکے۔اس کے بعد ساحل نے تین اشاعتوں میں غامدی صاحب کا نقد لکھا اور غامدی صاحب کو پیش کش کی کہ ہر ایک شمارے کے بعد ان کا پورا شمارہ غامدی صاحب کے لیے حاضر ہے لیکن غامدی صاحب نے اس مشقت سے گریز مناسب سمجھا۔صرف یہ کہا کہ آپ اپنا کام کریں اور میں اپنا کام کر رہا ہوں فیصلہ تاریخ کرے گی۔۔۔۔سنت کے معاملے میں غامدی صاحب کے موقف کی صداقت یا تردید کے لیے تاریخ کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں ہے یہ فیصلہ علم وعقل کی بارگاہ میں آج ہی کیا جاسکتا ہے۔غامدی صاحب نے خود فرمایا کہ سنت کی تعداد قرآن کی آیات کی طرح ناقابل تغیر ہے۔سنتوں کو گن گن کر بتایا جاسکتا ہے اور انہوں نے چالیس کی تعداد مقرر بھی کردی لیکن اب میزان ۲۰۱۲ء میں یہ تعداد صرف ۱۷رہ گئی تو ان کے اپنے اصول کے مطابق سنت ماخذ قانون رہا یا نہیں؟

(۶) کراچی کے ماہ نامہ ساحل نے غامدی صاحب کی کتاب مقامات طبع دوم جولائی ۲۰۰۶ء المورد ۵۱۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور میں غامدی صاحب کے عربی مضمون ''شرح الشواہد الفراہی'' پر ڈاکٹر رضوان علی کا نقد شایع کیا جس میں غامدی صاحب کی عربی کی چھ سو سے زیادہ غلطیاں بتائی گئیں تھیں۔ان میں تذکیر و تانیث کی فاش اور فحش غلطیاں بھی شامل تھیں اسی کتاب کا ایک حصہ انگریزی میں بھی تھا جس میں غامدی صاحب نے انگریزی زبان میں شاعری کے جوہر دکھائے تھے۔ ماہ نامہ ساحل کے مدیر سید خالد جامعی صاحب نے غامدی صاحب کی انگریزی شاعری کے بارے میں ساحل میں مضمون شایع کیا جس میں بتایا گیا تھا کہ غامدی صاحب نے انگریزی کے کن کن بڑے شعراء کے مصرعے سرقہ کر کے اپنے نام سے شایع کر دئے ہیں۔عربی اور انگریزی زبانوں میں جب غامدی صاحب نے اپنا حال کل عالم پر آشکارا ہوتے دیکھا تو غامدی صاحب نے یہ کتاب بازار سے غائب کرادی۔مقامات اس لیے غائب کرائی گئی تاکہ عوام کو بتایا جا سکے کہ عربی مضمون اور انگریزی نظمیں غامدی صاحب کے طالب علمی کے نمونے ہیں۔کم و بیش یہی بات جناب عمار ناصر راشدی صاحب نے زاہد صدیق مغل صاحب سے ایک ملاقات میں کہی تھی لیکن سوال یہ ہے کہ اگر یہ تحریریں غامدی صاحب کے ایام طفولیت کی یادگار تھیں اور ان میں اغلاط اور سرقے کا دفتر مستور تھا تو اسے ۲۰۰۶ء میں شائع کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اور اس کتاب کے دیباچے میں جو جنوری ۱۹۹۹ء کی تحریر ہے بڑے کروفر سے کیوں لکھا گیا کہ یہ اردو،انگریزی اور عربی زبان میں چند ناتمام تصنیفات اور چند متفرق تحریروں کا مجموعہ ہے (دیباچہ مقامات طبع دوم جولائی ۲۰۰۶ء المورد ۵۱ کے ماڈل ٹائن لاہور)۔چلیے کتاب غائب ہوگئی قصہ ختم ہو جاتا لیکن اس دریدہ ذہنی کے بعد ۲۰۰۸ء میں یہی کتاب مقامات کے نام سے دوبارہ شائع کر دی گئی اور کتاب پر دھوکہ دینے کے لیے لکھا گیا 'طبع اول'۔

(۷) شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ کراچی یونیورسٹی کے تحت 'میزان' کے پہلے باب اصول و مبادی اور تیسرے باب الکتاب کے تیسرے جزو ''قانون سیاست'' پر شعبہ کی ہفتہ وار علمی نشست میں جناب سید خالد جامعی صاحب نے دونوں ابواب کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ پیش کیا۔دونوں مواقع پر غامدی صاحب کے مکتب کے مفتی اعظم جناب مفتی فیصل خورشید جاپان والا صاحب تشریف فرما تھے وہ میزان ساتھ لائے تھے جناب خالد جامعی صاحب نے ان کی موجودگی میں میزان کا ناقدانہ جائزہ پیش کیا اور دونوں نشستوں میں ان سے سوال پوچھنے کی بار بار درخواست کی گئی لیکن وہ کوئی سوال نہ کر سکے۔غامدی صاحب کے تمام قدیم غائب اور متروک شدہ نسخوں کی مدد سے جب ان کے علمی سفر کے طلوع و غروب کا منظر پیش کیا گیا تو مفتی صاحب خود حیران تھے اور نسخوں کو بار بار پلٹ کر دیکھ رہے تھے۔

تبصرۂ کتب

الفرقان

ترجمہ وتفسیر از شیخ عمر فاروق

شیخ عمر فاروق صاحب اپنے کمزور اور منحنی وجود کے علی الرغم عرصے سے خدمت دین پر کمر بستہ ہیں اور ہزاروں نو جوانوں سے بڑھ کر کام کر رہے ہیں۔ الفرقان سورۂ آل عمران اور سورہ الحجرات کا ترجمہ و تفسیر ہے اور اس کے آخر میں تیرہ عربی اسباق بھی دیے گئے ہیں تا کہ جن احباب کو عربی زبان سے واقفیت نہیں وہ چند ابتدائی اور اہم چیزیں جان لیں۔

شیخ صاحب کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ دینی خدمت مروجہ مسالک کی تنگنائیوں سے بالاتر ہو کر کرتے ہیں۔ ان کا طباعت کا ذوق بہت عمدہ ہے اور انہوں نے آج تک جتنی بھی چیزیں تیار کی ہیں وہ اپنے گیٹ اپ اور ظاہر میں بھی دلکش ہوتی ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ان کتابوں کو بیچتے نہیں بلکہ فری تقسیم کرتے ہیں صرف اس کی یہ شرط رکھتے ہیں کہ جسے کتاب مطلوب ہو وہ خود آ کر لے، ڈاک سے نہیں بھجواتے۔ اس سے پہلے وہ تفسیر سورۃ البقرہ ۸۵۰ صفحات، تفسیر پارہ عم (۶۵۰ صفحات) شریعت اسلامیہ کے محاسن (حصہ اول ۵۰۰ وحصہ دوم ۵۵۰ صفحات)، سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ دو حصے (۱۳۵۰ صفحات) اور الحکمۃ (مجموعہ احادیث ۱۰۰۰ صفحات) شائع اور تقسیم کر چکے ہیں۔

الفرقان (۶۷۲ صفحات) میں شیخ صاحب کا اسلوب یہ ہے کہ وہ مضمون کے لحاظ سے عنوان باندھتے ہیں۔ ترجمہ سلیس کرتے ہیں اور وضاحتی عبارتیں قوسین میں دیتے جاتے ہیں۔ پھر الفاظ کی لغوی تشریح کرتے ہیں اور پھر تفسیر کرتے ہیں اور معاصر مفسرین میں سے جس کی رائے انہیں موزوں ومناسب محسوس ہوتی ہے اسے بلاتکلف لے لیتے ہیں۔ ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ قرآن حکیم کا مدعا قاری پر واضح ہو جائے اور وہ اس میں بالعموم کامیاب رہتے ہیں۔ شیخ صاحب جامعہ پنجاب کے قریب ایک لائبریری اور ریسرچ سنٹر قائم کرنے کے لیے بھی کوشاں ہیں تا کہ ان کاموں کو ایک مرکز مل جائے۔

برائے رابطہ:

شیخ عمر فاروق صاحب 15-B وحدت کالونی، لاہور 0331-7585960, 042-37810845